مکالمہ
واصف علی واصفؔ
مذاکرے
مقالات
انٹرویوز

واصف علی واصف کے

• مذاکرے • مقالات • انٹرویوز

کاشف پبلی کیشنز

۳۰۱۔ اے، جوہر ٹاؤن ۔ لاہور

نام کتاب	....	مکالمہ ___ واصف علی واصفؒ کے مذاکرے، مقالات اور انٹرویوز
ایڈیشن	....	اول
ناشر	....	کاشف محمود کاشف پبلی کیشنز ۳۰۱۔اے، جوہر ٹاؤن ـــ لاہور
ٹائیٹل	....	رئیس نذیر احمد
قیمت	....	۱۷۰ روپے

میں ایک شخص ہوں مجھ سے ہے ملتوں کا ظہور
حقیقتوں کو جنم دینے والا خواب ہوں میں

(واصف علی واصف)

فہرست

☆○☆

پھیلتی جائے بات کی خوشبو

انسان کے وجود میں آنے کے بعد جو پہلی چیز سامنے آئی وہ ایک مکالمہ تھی۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ اے علم اور حکمت رکھنے والی ذات! تو یہ کس کو پیدا کر رہا ہے جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ مکالمہ کی یہ روایت تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار میں اپنی ارتقائی تشکیل سے گزرتی رہی۔ کبھی ابراہیمؑ اللہ سے مکالمہ کرتے ہیں کہ تو مرنے کے بعد زندہ کیسے کرتا ہے اور کبھی وقت کے فرعون کے سامنے ایک ایسا شخص بولنے لگ جاتا ہے جس کی زبان میں پیدائشی لکنت ہوتی ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کوہِ صفا پر چڑھ کر ہمارے حضور پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر میں تمہیں کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر آرہا ہے تو کیا تم مان لو گے۔ صداقت کی مہر سے ثبت یہ مکالمہ تاریخ میں ایک اعلیٰ مقام رکھنے کے ساتھ ساتھ علم دینے کا مؤثر ترین ذریعہ تھا۔ جدید تعلیمی تکنیک میں آج کل یہ اسلوب اپنایا جارہا ہے کہ روایتی لیکچر دینے کی بجائے مکالمہ یا ڈائیلاگ کے ذریعے طلباء کو تعلیم دی جائے۔ واصف صاحبؒ نے جب

رشد کا سلسلہ شروع کیا تو انہوں نے مکالمہ کے اسلوب کو اپنایا۔ اس اسلوب کے ذریعے انہوں نے بلاغت کی نہج کو بڑی مہارت سے آگے بڑھایا۔ وہ اس خوبی سے تکلم فرماتے تھے کہ اس وقت ہر سننے والے کو کلام کا ایک ایک لفظ سمجھ بھی آتا تھا اور اس پر اثر بھی کرتا تھا۔اس طرح ان کی بات کو بے حد پذیرائی بھی ملی اور قبولیت بھی۔ ان کے مکالمہ کے اس فن کی تاثیر کا دائرہ بڑھتا ہی چلا گیا اور آنے والے دنوں میں اس کا ایک اور اعجاز یہ دیکھا جائے گا کہ علم پھیلانے کے روایتی طریقے کی بجائے واصف صاحبؒ کے فنِ مکالمہ کی یہ روایت ترویج پا جائے گی اور یہ معمول کا اسلوب بن جائے گا۔ ان کے اسی ہنرِ مکالمہ کا یہ کمال ہے کہ ان کا کلام آج کے دور کا امام الکلام بن چکا ہے۔ ان کے انہی مکالمات پر مشتمل کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں اور مزید آنے والی ہیں۔ اس مجموعے میں مختلف محافل میں ان کے مکالمے' انٹرویو اور خطبات کو ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کے خطبات میں بھی یہ خاص بات دیکھی گئی کہ خطبے کے آخر میں محفل ختم نہیں ہوتی بلکہ لوگ ان سے سوال پوچھتے ہیں اور پھر وہ ان سے سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے ایک ایک نکتے کی وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح واصف صاحبؒ کا یہ اسلوبِ مکالمہ اپنے کمال پر پہنچتا ہوا نظر آتا ہے۔ کچھ ایسے ہی احوال پر مشتمل یہ مجموعہ پیش کیا جارہا ہے تاکہ ان کے پُرجہات علم کے ایک اور گوشے سے ملاقات ممکن ہو سکے اور "واصفیات" کا ایک اور پہلو سامنے آجائے۔

معروف ادبی جریدے " ادبِ لطیف " نے ۱۹۸۶ء میں اپنا گولڈن جوبلی نمبر شائع کیا۔ اس سلسلے میں ادارے نے ایک مکالمے کا اہتمام کیا۔ گفتگو کا عنوان تھا "گذشتہ پچاس برسوں میں تصوّف کا عروج" ادارۂ ادب لطیف کی طرف سے محترم اظہر جاوید نے نمائندگی کی۔ جب کہ سہیل عمر، شاہین حنیف رامے اور اشفاق احمد کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ واصف صاحبؒ نے تصوّف کے پیچیدہ موضوع اور اس سے منسلک مسائل کو جس آسانی سے سمجھایا ہے، اس سے ان کی اس موضوع پر کامل دسترس کے علاوہ فنِ سہل نگاری اور ہنرِ مکالمہ کے منفرد وصف کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔

شروع دن سے ہی وابستہ چلے آ رہے ہیں۔ ان گذشتہ پچاس برسوں میں اگر آپ کو تصوّف کے اوپر یا روحانیّت کے اوپر بطورِ خاص کچھ لوگوں کی توجّہ مرکوز ہوتی نظر آتی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب میں لوگوں نے اس کی طرف توجّہ دینا شروع کی تھی۔ ہمارے یہاں اردو میں' فارسی کے تتبّع میں تصوّف کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے' بہت کچھ کہا گیا ہے بلکہ اس برِّصغیر میں اسلام کا وجود ہی تصوّف کے خمیر سے گوندھا گیا ہے اور یہاں پر جو اسلام پھیلا' وہ اسی رشتے سے پھیلا جو رشتے تصوّف کی کڑیوں میں آنکڑے بن کر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب جو ہمیں پچھلے پچاس برسوں کا جائزہ لینا ہے تو یہ یاد رکھنا ہو گا کہ اس نصف صدی کے ابتدائی دس بارہ برسوں بلکہ بیس تیس برسوں میں تصوّف کی طرف لوگوں کا رجحان کم نظر آئے گا' اب زیادہ ہے۔ میں چونکہ ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اب مغرب میں اس کی طرف خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ تیسری دنیا کا پڑھا لکھا طبقہ بھی اس سے متاثّر ہو رہا ہے تو ہم بھی اس کو مغرب کے حوالے سے جاننے لگے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں اس کا مواد پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس لئے اس کو سمجھنے میں یا اس سے تعارف حاصل کرنے میں ہمیں اتنی مشکل درپیش نہیں آ رہی جتنی کہ کسی اور ملک کے باشندے کو پیش آ سکتی ہے۔

یہ ایک مسئلہ ہے۔ واصف صاحب اس کی زیادہ وضاحت فرمائیں گے۔ میرا خیال ہے تصوف ہمارے دین اور ہماری شریعت سے کوئی مختلف چیز نہیں۔ یہ بہت توجّہ طلب بات ہے اور یہ دین ہی کی طرف لے جانے والا ایک راستہ ہے۔ جو شخص تصوّف میں داخل ہوتا ہے' وہ

دین کے عین دل میں، قلب میں اترتا ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر تصوّف کی کیا ضرورت تھی۔ اگر شرع ہمارے پاس موجود ہے اور اسے آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے تو پھر تصوّف کی کیا ضرورت؟ میں ایسے موقعوں پر عرض کیا کرتا ہوں کہ آسانی سے اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

تو جو ہمارے بزرگ تھے، جو ہمارے مہربان تھے، جو ہم پر شفقت کرنا چاہتے تھے، انہوں نے شرع کی کلاس کے لئے ہمارے واسطے ایک کنڈرگارٹن سسٹم وضع کیا، جو بچے تعلیم کی طرف شوق سے رجوع نہیں کرتے اور انہیں رغبت نہیں ہوتی، ان کے لئے مونٹیسوری یا کنڈرگارٹن بنائے جاتے ہیں اور جب کنڈر گارٹن کا طالب علم پہلے ایک دو تین سال پورے کر لیتا ہے تو پھر رخ اس کو وہی دے دیا جاتا ہے، جو ایک عمومی تعلیم کا ہوتا ہے۔ چینل اس کا وہی رہتا ہے۔ تو اب لوگوں کو، میں سمجھتا ہوں، شرع کی طرف مائل ہونے میں، اس سہارے سے، جسے میں کنڈرگارٹن کا نام دے رہا ہوں، زیادہ آسانی ہونے لگی ہے۔

ادبِ لطیف :

آپ کی بات کو زیادہ وسعت دینے کے لئے ایک سوال ہے کہ کچھ لوگ طریقت اور شریعت کو الگ الگ بتاتے ہیں۔

اشفاق احمد :

بالکل الگ رکھتے ہیں۔ میں نے یہ سوال ہونے سے پہلے ہی پیش بندی کر دی۔ طریقت اور شریعت میں بالکل کوئی فرق نہیں اور اس بالکل

کے نیچے آپ گہری سطر لگالیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ طریقت کے راستے سے شریعت کی کمند کو پکڑنا آسان ہے اور بلاواسطہ طور پر اس کو پکڑنے میں لوگوں نے کچھ مشکلیں محسوس کیں جس کے لئے ہمارے بزرگوں نے یہ راہ عطا کر دی اور باقی یہ کہ انسانی زندگی میں روحانیت کا جو عمل دخل ہے' وہ ہم آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ ہمارے اردو ادب میں' جیسا کہ آپ ابھی ذکر کر رہے تھے' غوث علی شاہ قلندرؒ کی کتاب "تذکرۂ غوثیہ" کی وہ تو ہمارے آج کی بات ہے لیکن اس سے پہلے بھی بے شمار تذکرے تھے۔ کمبل پوش جیسا آدمی بھی اس طرح کی بات کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں سب سے پہلی تصوّف کی کتاب ملاّ وجہی کی "سب رس" ہے جو شروع سے لے کر آخر تک تصوّف ہے بلکہ بعض اوقات وہ خاصی غیر دلچسپ ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں شرع کی کتابیں بھی ایسی ہوں گی مگر اب اس مقام پر پہنچ کر آپ اسے بڑی آسانی سے اور بڑی دلچسپی سے پڑھ سکتے ہیں۔

ملاّ وجہی کی "سب رس" سے لے کر آج واصف علی واصف صاحب کی "کرن کرن سورج" تک۔ اور بیچ میں بابا جی نور والےؒ۔ سخی سائیں راضیؒ۔ جن لوگوں کو میں جانتا ہوں' ان کا ذکر کر رہا ہوں۔ میں ان کا شاہد ہوں۔ وہاں تک جتنی منازل بھی طے کیں' ان کا خمیر ہمارے وجود میں اور ہمارے دین میں موجود رہا ہے۔ اب اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کو اپنے آپ کو سمجھنے میں کچھ آسانی عطا ہو جائے گی۔

ادبِ لطیف:

سہیل عمر صاحب سے پوچھنا یہ ہے کہ اشفاق صاحب نے یہ بڑی

گہری بات کہہ دی ہے کہ ہمارے ہاں مغرب کی دیکھا دیکھی تصوّف میں دلچسپی بڑھی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے یہاں تصوّف کی صدیوں پرانی روایت ہے۔ آپ نے چونکہ مارٹن لنگز کے حوالے سے اور یوں بھی آپ نے تصوّف کے سلسلے میں مطالعہ اور کام جاری رکھا ہے تو کیا آپ کی رائے بھی اشفاق صاحب سے ملتی ہے.....؟ یا ہمارے ہاں زندگی کے ہر شعبے میں کوئی نہ کوئی مخصوص لہر آ جاتی ہے۔ مذہب کی روایات میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ کبھی کسی خاص مزاج یا رویے کو عروج ملتا ہے' کبھی لمبا وقفہ آ جاتا ہے۔ مثلاً" دس پندرہ برس پہلے تک نعت شریف کوئی کوئی اور کبھی کبھی لکھتا تھا' آج کل ہر شاعر نعت لکھ رہا ہے۔

سہیل عمر:

بنیادی طور پر اشفاق صاحب نے جو کہا ہے میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔ مغرب میں پچھلے پچاس برسوں میں جو دلچسپی عموماً" اور بیس برسوں میں خصوصیّت سے نمایاں ہو کر آئی ہے' کتابوں کے حوالے سے' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اگر بدھ ازم پر کوئی چیز بکتی تھی تو وہی مارکیٹ میں زیادہ آنے لگتی۔ یوگا میں دلچسپی بڑھی تو وہ کتابیں چھپنے لگیں۔ پھر امریکہ اور یورپ کے ایک پورے گروپ کا ظہور ہوا جو یہاں کی اصطلاحات میں بات کرنے لگا اور اسی ڈِکشن میں بات کرنے لگا جو عصری عہد کا آدمی سمجھتا ہے۔ اب ایک تو دیکھا دیکھی کی دلچسپی ہے۔ وہ اپنی جگہ درست' کہ جو چیز انگریزی میں آ رہی ہے وہ انگریزی پڑھا لکھا طبقہ سلام کر کے قبول کرتا ہے۔ لیکن پچھلے بیس برسوں میں جو چیزیں پیش کی گئیں' ان کی مثال اس سے پہلے کے تیس برسوں میں نہیں ملتی

اور وہ ذہنی سطح پر کلام کرتی ہیں۔ جدید پڑھنے والوں میں اس کی ایک خاص کشش اور وقعت ہے۔ اس میں دیکھا دیکھی کا عنصر تو ہوا، بہت سا عنصر یہ ہے کہ اس زبان میں کتاب آ رہی ہے، جس کو وہ بآسانی سمجھنے لگا ہے جبکہ پچھلی جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا ان میں اور آج کے قاری کے درمیان ایک ذہنی خلیج ہو گئی ہے اور ایسے میں کسی نہ کسی ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اس خلیج کو پاٹ کر، یا اس خلاء کو بھر کر رابطہ بحال کر دے۔

دوسری بات جو اشفاق صاحب نے فرمائی کہ شریعت اور طریقت ایک ہیں بالکل درست ہے۔ سبھی مستند لوگ یہی کہتے ہیں۔ البتہ وہ جس کنڈر گارٹن کا حوالہ دے رہے ہیں وہ عجیب ہے کہ کنڈر گارٹن بھی ہے اور پی ایچ ڈی کا مقام بھی رکھتی ہے۔

ادبِ لطیف:

جنابِ واصف کی توجہ درکار ہے۔

واصف علی واصف صاحب :

تصوّف اور اس کے تاثرات اور اس کا ارتقاء اور اس کی طرف رحجان، یہ تو بعد میں سوچا جائے گا۔ پہلے تو یہ ہلکی پھلکی وضاحت ہونی چاہئے کہ تصوّف ہے کیا..... ؟ تاکہ ہمیں سمجھ آ جائے۔ آپ کی، سہیل عمر کی اور اشفاق احمد صاحب کی بات سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ تصوّف شریعت یا دین کی کوئی Application ہے، اس انداز کی کہ جس سے آسانی پیدا ہو اور محبّت پیدا ہو یا آپ یوں کہہ لیں کہ یہ تصوّف کوئی

بن جاتا ہے۔ Applied Religion میرا جہاں تک خیال ہے' میں تو یوں
کہوں گا' ذرا اس انداز سے ہم سوچ سکتے ہیں کہ ایک مذہب کو ہم لوگوں
نے' یا انسانوں نے Defend کر رکھا ہے' عمل کے ذریعے۔ ہم اس پر
چلتے رہے کہ مسلمانوں کا عمل ہے کہ اسلام محفوظ ہے۔ اس کے اندر یہ
بھی واقعہ ہے کہ اسلام کی حفاظت اللہ کریم نے اپنے ذمے لے رکھی ہے
اور جس نے اسے محفوظ فرمایا ہے وہ اسی اسلام کی حفاظت کے لئے اپنے
اس دین کے ماننے والوں میں ایک خاص قسم کا شعور اور خاص قسم کا عرفان
عطا فرماتا ہے۔ اس کا فارمولا یہ نہیں ہے کہ مغرب نے کچھ کر لیا ہے تو
مشرق بھی ضرور وہی کرے گا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پچھلے بیس برسوں
میں' جن کا ذکر آپ نے کیا ہے عنایات کا سلسلہ زیادہ ہو گیا ہے' اللہ کریم
کی طرف سے۔ جب ہم تصوف کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہر صوفی الگ
الگ انداز سے آیا ہے۔ دین ایک ہے۔ شریعت ایک ہے۔ تصوف کے
سلسلے بہت ہیں' چشتی' قادری' نقشبندی' سہروردی....! تو اتنے سلسلوں
کے ہونے کی پھر کیا وجہ ہے؟ ان سلسلوں کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس
ملک کے جغرافیائی حالات پر شریعت کے نافذ ہونے' یعنی کہ قلوب پر نافذ
ہونے کے لئے اور لوگوں میں آسانی پیدا کرنے کے لئے خاص طریقت'
خاص مزاج دیا۔ اگر کسی میں موسیقی کا شعور ہے تو اس کو چشتی طریقت
میں وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ نعت' قوالی اور منقبت' اس کے انگ میں
شامل ہوتے ہیں اور دین کا شعور بھی حاصل کرتا ہے۔ لیکن اپنے انداز
سے کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر دور میں اپنے وقت کی ضرورت کے
مطابق اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ لوگوں کو دین کے قریب

لانے کے لئے کسی نہ کسی شخص کو عرفان، صداقت یا محبت عطا کر دی جاتی ہے۔

ایک چیز بڑے غور والی ہے کہ شریعت پر عمل کرنے والے کو کیوں ضرورت محسوس ہو گی کہ وہ تصوّف کی طرف آئے یا ادھر آنا لازم ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ شریعت، اہل ظاہر عبادت کرتے کرتے یا دین کو تبلیغ میں شامل کرتے کرتے یا بے تعلّق تبلیغ میں چلتے چلتے تبلیغ اس مقام تک چلی جاتی ہے کہ لوگوں کے دل آپس میں مانوس نہیں ہوتے یا ان میں محبّت نہیں بڑھتی، تبلیغ پھیلتی چلی جاتی ہے اور دل جدا ہوتے رہتے ہیں۔ تو اس سلسلے کو دور کرنے کے لئے پھر ایک اہلِ دل آ جاتا ہے۔ وہی اہلِ دل جو پرانے زمانے میں آیا کرتا تھا اور خدانخواستہ لوگوں کو مذہب سے جو مایوسی ہو رہی ہوتی ہے اس سے بچانے کے لئے، کہتا ہے میرے قریب آؤ، وہ تیمارداری کرتا ہے، تیمارداری اس کی یہی ہے کہ آپ جو بیمار ہو چکے ہیں، قریب آؤ، ہم آپ کو اللہ کے قرب کا رستہ بتا دیتے ہیں۔ دین بھی انہی لوگوں کے ذریعے پھیلا۔ مقصد یہ ہے کہ ہر دور میں خاص طور پر پچھلے زمانے سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں کا دین سے محبّت کے طور پر کسی ایک ایسے عمل میں شریک ہو جانا، یہ تصوّف کا عمل ہے۔

اب اس میں ایک چیز..... کہ انسانی سطح پر کسی شخص کا باشعور ہو جانا، وابستہ ہو جانا یا گہرائی میں چلے جانا..... اس سے کسی سماج کا کوئی تعلّق نہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح، خدانخواستہ ..... کوئی خدا ہو جائے، بے شک ہو جائے، بلند ہو جائے! اس سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے، مقصد

یہ ہے کہ جو اہلِ دل لوگ ہیں ان میں بے شمار ایسے تصوّف والے ہیں' جو بہت ہی بلندیوں تک گئے ہیں' جن کا ذکر ایسے کسی تذکرے میں نہیں ہے۔ کوئی کوئی ایسا انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ اِذن عطا فرمایا ہو کہ وہ اپنے تصوّف یا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امّت کو اجتماعی طور پر اس محبّت کی دعوت میں شامل کرتا ہے۔

یہاں پر ایک بڑی عجیب سی بات ہو گی۔ تصوّف اور شریعت کے درمیان کچھ فرق کے طور پر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کربلائے معلیٰ میں جو واقعہ ہوا کہ حضرت امام عالی مقامؑ کو شہید کرنے کے بعد لوگوں نے نماز ادا کی۔ شریعت والوں نے شریعت ادا کی' طریقت کو پہچانے بغیر' کہ محبّت' اللہ' اللہ کے رسولؐ اور اہلِ بیتؓ کی محبّت کیا ہوتی ہے۔ محبّت کو ترک کر کے دین کے ایک بنیادی اصول (As a Principle) کے طور پر اس پر چلتے گئے' Person کو نکال کر..... تو تصوّف جو ہے وہ Person (فرد) کو اہمیت دیتا ہے اور اس کے ذریعے سے' اس ریفرنس کے ذریعے لوگوں کے اندر صداقت کا شعور پیدا کرتا ہے۔ آپ پاکستان کی تخلیق دیکھیں۔ سب جانتے ہیں کہ پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ ..... حالانکہ پاکستان کا مطلب یہ نہیں ہے۔ پاکستان کا مطلب ملک ہے۔ لا الہ الا اللہ کا مطلب تو کچھ اور ہی ہے ناں۔ یعنی کہ جو مذہب ہے' وہ ایک ایسے Practical انداز میں لوگوں کے مزاج میں شامل ہو گیا کہ لوگ وابستہ خیال ہو گئے۔ تو تصوّف کا مطلب یہی ہے کہ لوگوں کا شریعت کے اندر محبّت کے طور پر دین میں شامل ہو جانا۔ یعنی دین کو' شریعت کو'

محبت کے ساتھ سجدہ کرنا' ایک آدمی سجدہ کر رہا ہے اور ایک دوسرا آدمی بھی سجدہ کر رہا ہے۔ جو محبت کے ساتھ سجدہ کر رہا ہے اس کو ہم کہیں گے اہلِ تصوّف ----- اور جو صرف سجدہ کر رہا ہے' اس کو اہلِ ظاہر کہیں گے یعنی شریعت والا۔

شریعت محبت جو ہے' اسے ہم کہیں گے طریقت۔ طریقت میں اپنے شیخ' اپنے رہبر کے ساتھ' اپنے گرو کے ساتھ جو وابستگی ہے یہ بھی ضروری ہے۔ تصوّف اس شیخ کے بغیر نہیں چل سکتا اور جس طرح اللہ کریم نے اسلام کی حفاظت اپنے ذمّے لی ہے' اللہ ہی کی طرف سے ان لوگوں کو بھی شعور عطا ہوتا ہے کہ عام لوگوں کو مایوسی سے نکالا جائے اور اب جو آپ نے کہا کہ پچھلے بیس برسوں میں تصوّف کی طرف زیادہ رجحان ہوا ہے تو اشفاق صاحب کی یہ بات' بڑے غور والی بات ہے۔

اشفاق احمد:

جی میں سُن رہا ہوں!

واصف علی واصف صاحب:

اس کی بڑی وجہ جو آپ نے بیان کی وہ صحیح ہے۔ اس کے برعکس بھی صحیح ہے کہ لوگ مذہب کے زنگ سے بچنے کے لئے تصوّف کی طرف مائل ہوئے یعنی مذہب کے اندر جو سختی نظر آئی' جو اہلِ شریعت کے اندر تیزی اور سختی اور دوسرے واقعات نظر آئے ان سے بچنے کے لئے' دل والوں کی تلاش شروع کر دی اور دل والوں کی تلاش کرنے والے' دل والے ہی ہو جایا کرتے ہیں۔

ادبِ لطیف:

واصف صاحب! کیا ہمارے عہد کی جو معاشی مجبوریاں ہیں اور جو معاشرتی ٹوٹ پھوٹ ہے' اس میں لوگ ایک طلب کے لئے' توجہ چاہنے کے لئے اور ایک تسلی کے لئے تصوّف کی طرف آ رہے ہوں؟

واصف علی واصف صاحب:

ہم تصوّف کی ایک اور تعریف کرتے ہیں۔ زندگی کا عمل' انفرادی زندگی کا عمل' اگر یہ عمل ہم ذہن کے حوالے سے کریں تو ہم کہیں گے کہ وہ مفکر ہے۔ جو اپنی زندگی کے تمام عوامل کو ذہن کے حوالے سے گزارے ہم کہیں گے' فکر والا ہے' مفکّر ہے' اگر دل کے حوالے سے ہر واقعے کو گزارے تو آپ کہیں گے کہ یہ شخص شاعر ہے۔ اسی طرح کوئی شخص یہ عمل روح کے حوالے سے گزارے' تو کہا جائے گا کہ وہ روحانیّت والا آدمی ہے۔ تصوّف کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے اندر ہونے والے ہر واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانے یعنی اس کے حوالے سے گزارے۔ پھر ہم کہیں گے کہ اس کے اندر تصوّف کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔

ادبِ لطیف:

یہاں سے ایک اور سوال کی جسارت ..... تصوّف کے لئے آپ نے زور دیا تصوّرِ شیخ پر... یا توجّہ پر؟

واصف علی واصف صاحب:

یا تعلق پر!

ادبِ لطیف :

جی ..... تو ہمارے ہاں عموماً" یوں ہوتا ہے کہ بعض اوقات' خدانخواستہ ..... جو کم ظرف سے مرید ہوتے ہیں وہ صرف شیخ ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ خدا پیچھے رہ جاتا ہے۔ شاید اس وجہ سے بھی لوگ تصوّف سے بدکتے ہوں گے؟

واصف علی واصف صاحب :

نہیں تصوّف سے بدکنے کی اور وجوہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ جب آستانوں پر یا شیخ کے پاس جاتے ہیں تو ان میں سے اکثر لوگ اپنی آرزوئیں لے کر جاتے ہیں' آرزو پوری ہو گئی تو تب بھی تعلّق ختم ہو گیا' آرزو پوری نہ ہوئی' تو پھر بھی تعلّق ختم ہو گیا۔ یہ وابستگی عارضی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو سیدھا عرفان ذات کے لئے چلتے ہیں ان کو شیخ اگر صحیح مل جائے یا غلط مل جائے' ان کی منزل پوری ہو جاتی ہے۔ اس میں یہ حوالہ نہیں ہے کہ کیا وجہ ہے؟ عام طور پر بدکنے والی بات آپ نے ٹھیک کی ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں اتنا عرصہ شیخ کے پاس رہا ہوں۔ ایک تو میرا کام نہیں ہوا ہے' دوسرا میں نے نوٹ کیا ہے کہ شیخ کے ظاہر و باطن اور علم اور عمل میں فرق نظر آیا۔ اب یہاں مسئلہ یہ ہے کہ شیخ کی کسی خامی کی وجہ سے راستہ ترک نہیں کرنا چاہئے۔ راستہ ترک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پہلے دن ہی سے صداقت نہیں تھی۔ صداقت کا راستہ کبھی ترک نہیں ہوتا' چاہے اس کے سامنے سارا ماحول کاذب ہو جائے' پرواہ نہیں۔ اس لئے جو بدکنے والے ہیں وہ بدکنے

کی وجہ دریافت کر ہی لیتے ہیں مگر چلنے والے چل بھی رہے ہیں۔

حوالہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کو عملی طور پر کر کے دکھاؤ مثلاً" اسلام کہتا ہے کہ معاف کر دو۔ مگر معاف کیسے کریں...؟ جس نے آج تھپڑ لگایا ہے اسے معاف کیسے کریں؟ وہ پھر کر کے دکھاتا ہے کہ یوں کر دو۔ کل جو آیا تھا وہ میرے بھائی کا قاتل تھا۔ ہم نے اسے کھانا کھلایا تھا' ہم نے اسے معاف کر دیا۔ وہ جو عمل ہے جو اس شیخ نے کر کے دکھایا ہے۔ اس لیئے اس کو عملی سطح پر قابل عمل دکھایا۔ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ تصوّف یا جو بزرگ ہیں اسلام کا وہ عمل جو بظاہر مشکل ہے' وہ کر کے دکھا دیتے ہیں یعنی وہ فکر ان کے حال پر نافذ ہوتا ہے اس لیئے وہ صاحبِ حال کہلاتے ہیں۔

ادبِ لطیف :

واصف صاحب تصوّف کی ایک کڑی اہلِ ملامت کی بھی ہے' ذرا اس پر بھی روشنی ڈال دیں۔

واصف علی واصف صاحب:

اہلِ ملامت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ ایک انسان جب اللہ کریم کے راستے کی طرف جاتا ہے تو وہ ایک چیز سے بہت ہی خوف زدہ ہوتا ہے اور اس کو پہلے دن سے بتا دیا جاتا ہے کہ اگر کسی نے تجھے راستے میں روکا تو یہ بیماری ہو گی' اس سے راستہ رک جایا کرتا ہے' تو راستہ کس سے رکتا ہے .....؟ راستہ تعریف سے رکتا ہے۔ تعریف سے بچنا چاہئے۔ تعریف قاتل ہے۔ اہلِ ملامت وہ لوگ ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں

کہ جب ان کا فقریا ان کا تصوّف تعریف کے اندر آنے لگے یعنی لوگ ان کی تعریف کرنے لگیں تو پھر اس سے نجات کی راہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ تعریف سے بچنے کے لئے کچھ بد تعریفی کا پہلو نمایاں ہو' بلکہ ایک ڈیفنس بنایا ہے۔

ایک درویش نے روزہ رکھا ہوا ہے' ایک بستی سے گزر ہوتا ہے بستی کے لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ سرکار تشریف لائے ہیں۔ سارے لوگ استقبال کے لئے آ گئے۔ آپ نے سب کے سامنے کچھ کھانا شروع کر دیا۔ لوگوں نے باتیں بنائیں کہ یہ ہیں شیخ! ایسے ہوتے ہیں شیخ؟ ان کے جو ساتھی تھے' جو مرید تھے' انہوں نے پوچھا سرکار یہ آپ نے کیا کیا.....؟ انہوں نے کہا دیکھو' ساٹھ روزے کفارے کے رکھنے میرے لئے آسان ہیں' مگر اس مصیبت سے بچنا میرے لئے مشکل تھا۔ گویا تعریف سے بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ملامت' ایک تو تحفظ دیتی ہے ..... دوسرا نفس کے لئے ملامت ایک تازیانہ ہے۔ عام طور پر انسان دو چیزوں سے چلتا ہے' شوق سے چلتا ہے یا خوف سے چلتا ہے۔ ملامت سے اپنے نفس کی اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نفس کی اصلاح ذکر سے زیادہ ملامت میں ہے۔ ایک اور فیصلہ ملامت کے بارے میں' ایک بزرگ نے کہا' دیکھو' اگر ملامت ہی اپنانی ہے تو کیا یہ ملامت کافی نہیں ہے کہ اس ماحول میں نماز پڑھنے جائے جب کہ لوگ کہیں تو جھوٹی نماز پڑھ رہا ہے۔

ملامت والوں کا ایک پورا طبقہ ہے۔ وہ اہلِ دل ہیں' وہ قرآن پڑھنے والے ہیں' اللہ کی یاد کرنے والے ہیں مگر انہوں نے لوگوں سے

راستہ مخفی کرلیا ہے۔ بابا بلھے شاہؒ نے کہا تھا:۔

شرع کہے چل مسجد اندر حق نماز ادا کر لے

اور اس کے مقابلے میں: ؎

عشق کہے بوہا یار دا کعبہ پی کے شراب نفل پڑھ لے
شرع کہے اساں شاہ منصور نوں سولی اتے چاڑھیا سی
عشق کہے تساں چنگا کیتا بوہے یار دے واڑیا سی

ملامت یہ ہے کہ مجھے سید نہ کہو، کیوں نہ کہو؟ کیونکہ ہمارا عمل اس طرح کا نہیں ہے۔

ادبِ لطیف:

واصف صاحب، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جیسے سب لوگوں کے فرائضِ منصبی ہیں، جسے عام زبان میں کہا جاتا ہے کہ "ڈیوٹی" ہے۔ تو کیا اہلِ ملامت کا یہ فرض نہیں کہ یہ بھی عام لوگوں کو فیض پہنچائیں۔

واصف علی واصف صاحب:

تصوّف فیض پہنچانے کا پابند نہیں ہے۔ دو قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ لوگ اپنی نجات چاہتے ہیں۔ تصوّف اپنی ذات کی تکمیل کے لیئے ہے:

غلام فریدؔا اوہدیاں اوہ جانے، تو اپنی توڑ نبھا

یہ بھی تصوّف والے لوگ ہیں۔ ان سارے گروہوں میں سے کسی نہ کسی ایک کو فائز کر دیا جاتا ہے کہ اب تم لوگوں کی اصلاح کرو..... لوگوں کو یہ بتاؤ! لوگوں کی ایک بیماری ہوتی ہے۔ کیا؟ بڑی عجیب بیماری

ہوتی ہے یعنی مایوسی۔ اور کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ تصوّف اسی بیماری کا علاج ہوتا ہے کہ مایوسی سے بچاؤ۔ اپنے آپ سے مایوس ہونا۔ اپنے خدا سے مایوس ہونا۔ باقی امیری بھی آتی ہے' غریبی بھی رہتی ہے' غریب بھی پرامید ہو سکتا ہے اور امیر بھی۔ لیکن مایوسی جو ہے' فرسٹریشن' تصوّف اس سے نکالتا ہے۔

اور ہر تصوّف والا بھی یہ نہیں کرتا۔ ہر کسی کو اجازت ہی نہیں ہوتی' باقی تصوف والے تو اپنی تکمیل کرتے ہیں۔ عروج کرتے ہیں' مکاشفات ہوتے ہیں' مراقبے کرتے ہیں۔ یہ کوئی کوئی آدمی ہوتا ہے جسے یہ بتایا جاتا ہے کہ تم آگے لوگوں کو بتاؤ۔ حضور پاکؐ کی امّت کے لئے یہ لوگ Contribute کرتے ہیں۔ اہلِ تصوّف میں سے ہی ان کے مقامات الگ ہوتے ہیں اور ان کا ایک مقام ہوتا ہے' میں بتاتا ہوں کہ یہ مقام کیا ہوتا ہے۔

جب ان کو دیدار کا وقت آگیا' بلند دیدار کا' تو انہوں نے سر جھکا لیا اور کہا ہمارا دیدار یہی ہے کہ آپؐ کی امّت سرفراز ہو جائے۔ آپؐ ان پر احسان کر دیں۔ میرے لئے یہی دیدار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس امّت کو مایوسی سے نکالو تو میرا دیدار اتنا ہی ہے۔ یہی صورت ہے جب اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی قبولیّت کا وقت آگیا ہے۔

لوگوں کا خیال' قوم کا خیال' ملک کا خیال' ہر آدمی کے پاس یہ نہیں ہوتا۔ یہ عمل تصوّف والا ہے' چاہے اس کا مرتبہ کچھ بھی ہو۔

بے شمار ایسے بزرگ ہیں' چاہے قادری سلسلہ ہو' چشتی سلسلہ ہو' یہی وجہ ہے کہ آگے ہر آدمی اپنی طریقت کو الگ کرتا رہتا ہے۔ سارے

اصلاح پر فائز نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں اللہ خود کر لے گا۔ وہ خود جاننے والا، بہتر جاننے والا ہے، تو ضبط سے ذکر کر۔ بہرحال ایسے لگتا ہے کہ دین کا چراغ، اہلِ ظاہر کے کسی عمل کے سبب، بجھنے سے بچانے کے لئے ان اہلِ دل کو مقامات دیئے جاتے ہیں۔

پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے اس وقت جو مقامات تھے، غوث، قطب، ابدال، قلندر، زیادہ نمایاں تھے۔ اس کے بعد یہ مقامات نہیں آئے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں ان مقامات کا اظہار منع ہے کہ کوئی اہلِ دل، کوئی صوفی، کوئی صاحبِ تصوّف باقی مسلمانوں میں اپنے آپ کو، اپنے تعلّق کو اتنا نمایاں نہ کرے کہ باقی لوگ بد دل ہو جائیں۔ پہلے معاملہ غیر مسلموں کے ساتھ تھا۔ غیر مسلم جوگی بن کے آتے تھے اور ہمارے بزرگ یہ قطب اور ابدال ہوتے تھے۔

ادبِ لطیف :

شاید اسی وجہ سے کشف المحجوب میں حضرت داتا صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ صوفی کے لئے کشف و کرامات دکھانا زیادہ ضروری نہیں۔

واصف علی واصف صاحب :

بلکہ غیر ضروری ہے، منع فرما دیا گیا تھا۔ کشف و کرامت کے لئے کہتے ہیں کہ یہ بھی حضور پاک ﷺ کے معجزوں میں سے ایک واقعہ ہے۔ یہ انہی کی عطا ہے۔ وہ کرائیں تو کرائیں، ورنہ کچھ نہیں، پچھلے برسوں میں جو خصوصیّت سے اثر پڑا ہے، پڑنا ہی تھا۔ بہرحال ہماری تو ابتداء ہی تصوّف سے ہوئی ہے۔

ادبِ لطیف :۔

شاہین حنیف رامے !---- آپ سے پوچھنا ہے ' آپ پچھلے کچھ برس خاصا عرصہ امریکہ میں رہ کے آئی ہیں' جیسے اشفاق صاحب اور سہیل عمر صاحب نے کہا ہے کہ امریکہ اور یورپ میں تصوّف پر بہت کام ہو رہا ہے اور دلچسپی لی جا رہی ہے۔ بظاہر تو یہ معاملہ کمرشل ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی ہماری طرح اندر سے ہلے ہوئے ہیں۔ انہی برسوں میں ایک روسی مصنّف کی کتاب بھی تصوّف پر آئی ہے۔ وہ برصغیر میں بھی آیا تھا' تو آپ نے وہاں کوئی ایسا تجربہ کیا؟ یہاں آ کر آپ جناب واصف علی واصف صاحب کی روحانی محفلوں میں آ رہی ہیں۔ کچھ آپ بھی ارشاد کریں۔

شاہین حنیف رامے :

اشفاق احمد نے جو بات کی تھی اسلام کے حوالے سے ..... کہ اسلام تصوّف کے زور پر پھیلا ہے۔ اور واصف صاحب نے جیسے فرمایا کہ تصوّف والے لوگ جو ہوتے ہیں ان کا طریقہ محبت کا ہوتا ہے اور محبّت سے دوسرے لوگوں کو زیادہ اپنے قریب کیا جا سکتا ہے۔ پھر یہ جو شریعت اور طریقت کی بات ہے' اسلام میں بھی اس طرح کے دو گروپ ہیں۔ ایک تو ملاّ اِزم ہے۔ مُلاّ کا طریقہ شریعت کا ہے اور مُلاّ دین سے ایک طرح سے لوگوں کو بھگا دیتا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ظاہر بھی ہوتا ہے اور باطن بھی' جس طرح بادام ہے' ایک چھلکا ہے اور ایک مغز۔ شریعت پر چلنے والے لوگ جو ہوتے ہیں یعنی مُلاّ جو ظاہر پر زور دیتے ہیں باطن کا وہ ذکر ہی نہیں کرتے۔ نماز پڑھانا یا شلوار کے پائنچے اتنے اونچے ہونے

چاہئیں وغیرہ۔ وہ انہی باتوں پر زور دیتے ہیں۔ لیکن اصل میں آپ لوگ اگر مذہب کی پوری تاریخ کو دیکھیں تو شریعت اور طریقت نے دو واضح گروپ پیدا کئے ہیں۔ شریعت پر چلنے والے جو لوگ ہیں' عام طور پر ہمارے ہاں انہیں یہودیت سے ملا دیا جاتا ہے کیونکہ یہودیوں میں یہ ہے کہ قانون پر بہت زور ہے۔ شریعت پر بہت زور ہے لیکن محبّت کا سبق نہیں ہے۔ اس کے بعد ردِ عمل ہوا تو عیسائیت میں معاملہ دوسری طرف چل نکلا۔ محبّت کی طرف۔ محبّت یعنی طریقت کی طرف چل نکلے اور اسے انہوں نے طریقت کی بجائے رہبانیت کا نام دیا۔

جب رسول کریم ﷺ آئے تو انہوں نے ان دونوں چیزوں کو ملایا' ظاہر اور باطن کو' تزکیّہ کو اور شریعت کو جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بادشاہت بھی کی' عام آدمی کی زندگی بھی گزاری' جنگیں بھی لڑیں' لیکن ان کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ وہ غار حرا میں بھی جا کر بیٹھے تھے۔ یوں ان کی زندگی کے ارد گرد ایک خول بھی بنتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات صرف ظاہری نہیں' باطنی بھی ہے' اسلام کے حوالے سے۔میں واصف صاحب سے پوچھنا چاہوں گی کہ حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی میں شریعت اور طریقت دونوں ملی ہوئی ہیں اور میں سوچتی ہوں کہ ایک صوفی جو ہے وہ شریعت کو Negate نہیں کرتا (نفی نہیں کرتا) شریعت پر بھی وہ چلتا ہے مگر محبّت کے ساتھ۔ وہ دل کو گداز کرتا ہے' اور میں اس طرف بھی آؤں گی کہ امریکہ میں رہ کر میں نے کیا دیکھا اور کیا محسوس کیا۔

شاہین :

واصف صاحب سے میں یہ پوچھنا چاہوں گی کہ کیا رسول کریم ﷺ صوفی تھے۔ کیا ہم انہیں صوفی کہہ سکتے ہیں؟

دوسری بات یہ ہے جو میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہہ رہی ہوں کہ میں تو زیادہ اپنی ذات کے حوالے سے' واردات کے حوالے سے کر سکتی ہوں اور وہی بات سچی ہوتی ہے جو آپ کے اندر سے پھوٹے اور نکلے اور جب آپ کے اندر تلاش ہو تو پھر آپ کو کسی صادق سے ملا دیا جاتا ہے۔ میرے اندر یہ تلاش تھی' وہ بھی میں مشاہدہ کرتی رہی۔ خود حنیف صاحب کئی رستوں پر چلے ہیں۔ بہت خاک چھانی ہے۔ جس میں مغرب کے بھی کچھ طریقے تھے جو میں بہت نزدیک سے دیکھتی رہی تھی۔ مگر میرا دل اس طرح سے کبھی کسی رستے کی طرف نہیں لگا کہ میں اعلان کروں کہ میں نے راستہ پا لیا ہے۔ اب یہ ہے کہ اتنی عمر گزارنے کے بعد ---- میں اللہ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے ایک ایسے صاحبِ حال شخص سے مجھے ملایا ہے جس کی صداقت اور سچائی میرے دل تک پہنچتی ہے اور جو 'ملبہ اندر تھا' جس کے نیچے سچائی چھپی ہوئی ہوتی ہے' سچائی ہر انسان کے اندر ہوتی ہے' صرف ملبہ ہٹانے کے لئے کسی صاحبِ کیفیّت شخص کی ضرورت ہوتی ہے اور تصوّف میں یہی ہے کہ طریقت کسی زندہ مرشد کے بغیر سمجھ نہیں آ سکتی۔

یہ ٹھیک ہے کہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسولِ کریم ﷺ کو دیکھے بغیر' ان کے قریبی صحابہؓ سے بھی زیادہ محبّت کی۔ لیکن طریقت کی بات یہ ہے کہ جب تک آپ ایک صاحبِ حال کی

صحبت میں نہ بیٹھیں تو آپ کو وہ بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی' دل آپ کا گداز ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کے دل اور روح پر جو ملبہ پڑا ہوا ہے اسے ہٹانے کے لئے صاحبِ حال کا کردار بڑا اہم ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ میرا ملبہ ہٹ گیا ہے' بہر حال میری تلاش کی ابتدا یا آغاز ہو چکا ہے۔

مغرب میں ' جیسے اشفاق صاحب نے کہا کہ ہم مغرب کو دیکھ کر بطور فیشن تصوّف کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ لیکن جو اسلامی تصوّف ہے یا جو طریقہ اسلام کا ہے' میں نے جو وہاں دیکھا ہے یہ وہ نہیں ہے۔ وہ رہبانیّت کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ دنیا کو چھوڑنے کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے حوالے سے بات کر رہی ہوں کہ ان کا زور زندگی پر ہوتا ہے کہ زندگی کو آسان کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اس تفصیل میں نہیں پڑتے کہ نماز ایسے پڑھنی ہے یا یہ کرنا ہے' بلکہ زندگی کو اپنے لئے اپنے قریبی لوگوں کے لئے آسان کرنا ہے۔ انسان کی ایک اپنی ذات ہے۔ اس کی بھی ایک حقیقت ہے۔ اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ اس کا بھی ایک باطن ہے۔ آپ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا بھی پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتے۔ آپ حقیقت کے باطن میں بھی اتر کر نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے مرشد تو کہتے ہیں کہ اپنی بھی اہمیّت کو مانو اور یہی اسلامی تصوّف کا پس منظر ہے اور یہی لگن آپ کو کسی مقام پر رسول کریم ﷺ اور ذاتِ باری کے قریب بھی لے جاتی ہے۔

ادبِ لطیف:

ابتدا میں شاہین آپ نے واصف صاحب سے سوال کیا تھا کہ کیا رسول کریم ﷺ بھی صوفی تھے؟

واصف علی واصف صاحب:

آپؐ صوفی ہی کیا' اصفیا گر ہیں۔ آپؐ ہی کی برکت سے سارا کارخانہ چلتا ہے' سارے علوم چلتے ہیں۔ مگر جہاں وقت پیدا ہوتی ہے' غور کرنے میں' جب ایک عمل دے دیا شریعت نے' دین مکمل ہو گیا تو اس کے بعد اس دین میں اضافے کی گنجائش نہیں ہے' حضور پاک ﷺ کے پاس کوئی آدمی آیا اور عرض کیا کہ حضورؐ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا! کلمہ پڑھو۔ اس نے پوچھا۔ اب کیا کروں؟ ارشاد ہوا جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔ امن کا زمانہ ہے تو کچھ کاروبار کر لو' جہاد کا زمانہ ہے تو ہمارا ساتھ دو۔ کتاب نہیں پڑھنے کو دی۔ آپؐ کے فیض سے سارا تصوّف چلتا ہے' بلکہ اس حد تک کہ ایک صوفی اور ایک ظاہری شریعت والا دونوں اکٹھے ہوں' ان سے پوچھا جائے کہ دین کیا ہے؟ حضور پاک ﷺ کے حوالے سے وہ یہ کہے گا دین یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لانا جیسے حکم ہے اور اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں پر ایمان لانا۔

صوفی یہ کہے گا دین مجھے یہ سمجھ میں آیا ہے کہ دین بھی حضور پاک ﷺ پر نثار ہے' یہ بات حضور پاک ﷺ سے محبت کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتی اور اگر محبت نہ ہو تو یہ کہنا جرم ہے اور منع ہے۔

اور یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ حضور پاک ﷺ کی ہستی واحد ہستی ہے اس کائنات میں، آج تک جس پر نعت کہی جا رہی ہے۔ دیکھنے والوں نے کیا کہا۔ دیکھے بغیر والوں نے کیا کہا اور ان کے نعت کے انداز میں غور سے بیٹھنے والا شاعر یہ گواہی دیتا ہے کہ ایک واردات ہوئی ہے۔ کوئی نعت کہنے والا شاعر یہ نہیں کہے گا کہ بغیر آنسوؤں کے نعت ہوئی۔ گویا آج تک انؐ کی توجہ رائج چلی آرہی ہے۔

ادبِ لطیف:

غیر مسلموں نے بھی عقیدت کے ساتھ نعتیں کہی ہیں۔

واصف علی واصف صاحب:

جی ہاں غیر مسلموں نے آنسوؤں کے ساتھ نعت لکھی ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے جسے آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ نگاہ —— آج بھی اپنے اسی انداز سے کام کر رہی ہے، جس انداز سے آپ ﷺ کی محفل میں موجود رہنے والوں کے لئے کارگر تھی۔ ایک شعر شاید اس کیفیت کو زیادہ واضح کر دے ...... ؎

اس نظر میں فاصلے صدیوں کے بھی حائل نہیں
اپنے درویشوں سے وہؐ ہر دور میں آ کر ملے

آپ ﷺ کے بعد، آپؐ کے جانشینوں میں جہاں شریعت ظاہری ضرورت میں چلی گئی،فتوحات میں چلی گئی اور واقعات میں چلی گئی، اہل باطن ان راستوں سے گزرے، جن راستوں سے کوئی گزر ہی نہیں سکتا تھا، ابتلاء کا راستہ، کربلا کا راستہ، خاموشی کا راستہ، بعض اوقات بے شمار

دقتوں کا راستہ۔

اہلِ دل اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں ظاہرا" شریعت والے نہیں پہنچ سکتے۔ آپ یوں کہہ لیں، کہ عام آدمی اپنا حق مانگے گا اور جو صاحبِ تصوّف ہے اوہ اپنا حق بھی دے دے گا۔ یہی لوگ ہیں جن کے دم سے اسلام کے اندر رونق اور چراغاں ہے۔ رسول پاک ﷺ کو صوفی کہنے کا معاملہ ـــــ تو پیغمبر کو پیغمبر ہی کہو، رسول ﷺ کو رسول ﷺ ہی کہو۔ ان کو آپ دوسرا نام نہ دیں۔ بلکہ کسی صوفی کو بھی صوفی نہ کہو۔ کسی انسان کو انسان کہو۔ دل والے کو دل والا کہو۔ تصوّف کا کسی شعبے کے طور پر جائزہ نہ لو۔

اب یہ بات کہ گذشتہ کچھ عرصے سے تصوّف کی طرف زیادہ رجحان ہے اور شاید اسی حوالہ سے نعت بھی زیادہ لکھی جا رہی ہے۔ نعت اگر ضرورت بن جائے، سیاسی ضرورت بن جائے تو یہ بھی فائدہ نہیں لائے گی۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کے لئے یہ سیاسی ضرورت ہو اور اگر یہ محبّت کے طور پر ہو رہی ہے تو مبارک ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ تصوّف سمجھو، اللہ کریم کی عنایت سمجھو، حضور پاک ﷺ کی محبت سمجھو، اپنی صداقت سمجھو، یا اچانک اپنی روحانیت سمجھو کہ اس ملک کے لئے ضرور خوش خبری کا موقع ہے اور یہاں اہل دل حضرات ضرور اپنا Part Play کریں گے۔

ادبِ لطیف:

یہ آپ نے تصوّف کے جتنے سلسلے بھی بتائے، چشتی، قادری، سُہروردی ـــــ ان سب کا جاکر سلسلہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے،

ایک سلسلہ صرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ہے۔ اس میں کیا کوئی خاص وجہ ہے کہ باقی تمام سلسلے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے رجوع کرتے ہیں اور صرف ایک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔

واصف علی واصف صاحب :

انسانوں کے اندر مزاج کا فرق ہے اور دین پر کاربند ہونے کے لئے یعنی زندگی بذات خود ایک آزمائش ہے۔ اوپر سے دین کے فرائض لگے ہوئے ہیں۔ انسان تو بے چارا پریشان ہو جائے گا۔ انسان کا جو مزاج ہے' طریقت اس کے مطابق چلتی ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سلسلہ ملا ہے یا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔شجرہ یوں چلتا ہے کہ آپ کس کے مرید ہیں؟ اور اس طرح یہ شجرہ چلتا ہوا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک جا ملتا ہے اور آخرمیں حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جا ملتا ہے۔ بات ساری حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اہمیّت کی ہے۔ کوئی سلسلہ زیادہ چلا۔ اور ان کے زیادہ لوگ اس برّصغیر میں آ گئے۔ کچھ لوگ ادھر چلے گئے۔ اس لئے تقریباً" سارے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سلسلے چلے ہیں۔ ہمارے برّصغیر میں یہ حوالہ زیادہ ہے۔ ہمارے ہاں جو نقشبندی سلسلہ ہے وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق ہے۔ مجدّد صاحب نے بڑی عطا کی ہے' بڑی توجہّ لوگوں کی ادھر کرائی ہے۔ انہوں نے عبادت کے سلسلے میں تاکید کی ہے' پابندی لگائی ہے تاکہ دینِ الٰہی جیسے واقعات ظہور پذیر نہ ہوں۔ اگر لوگ قوالی کو ہی دین بنا لیں تو عزیز میاں جیسے لوگ آ جائیں گے۔ داتا صاحبؒ کا عرس ہو' تو وہاں حضرت داتا صاحبؒ کے علاوہ سب

کچھ ہوتا رہے گا۔ اس سے بچنے کے لئے کہا گیا کہ دین پر پورے کاربند ہو جاؤ۔

سہیل عمر:

گفتگو کے آغاز میں جو آپ نے فرمایا تھا مختلف سلاسل کے اپنے اپنے رنگ ڈھنگ ہونے کا ——— تصوّف کی تاریخ کے حوالے سے۔ تصوّف کا جو صدیوں میں سفر ہے اس سے کیا ہم اس طرح سوچ سکتے ہیں کہ اس سکیم کے پیچھے ایک طرح کی ڈیوائن جیومیٹری کام کر رہی ہے۔ جو مختلف انداز' نسل' مزاج یا جغرافیائی ضرورتوں سے زیادہ مطابقت رکھنے والے سلسلوں کی پٹیاں سی مقرر کر دیں کہ اس سے باہر وہ بڑھا ہی نہیں۔

واصف علی واصف صاحب:

بالکل ——— بلکہ یہ تو ثبوت ہے کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ جب تشریف لائے تو آپؒ نے وہاں کے لوگوں سے محبّت ہی شروع کر دی۔ لوگ جب آپؒ کے قریب آئے تو حضرت کا حسن و جمال تھا۔ آپ کا خیال تھا۔ بات کرنے کا انداز تھا۔ لوگ متاثر ہوکر کلمہ پڑھنے لگے۔ مسلمان ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد آپؒ کو پتہ چلا کہ لوگ کلمہ پڑھ گئے ہیں اور رات کو پھر مندر جاتے ہیں۔ آپؒ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے؟ اِدھر کلمہ پڑھتا ہے' اُدھر مندر میں جاتا ہے۔ اس نے کہا' سرکار بھجن سے پرانی محبّت ہے' یہ ہم سے نہیں چھوٹتی۔ حضرت نے کہا' اس کا بھی انتظام کرواتا ہوں۔ آپؒ نے یہ شروع کرا دیا۔ ~

تورے چرن لاگی، اب کت جاؤں

خواجہ گریب نواج

گویا یہ اس وقت کی ضرورت تھی!

میں کہتا ہوں دین جہاں Degenerate ہوتا ہے، وہاں روکنا چاہئے تھا وہاں نہیں روکا مگر خواجہ صاحبؒ کی موجودگی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوالی دینی فعل ہے۔ خواجہ صاحبؒ جیسا کوئی بندہ نہ ہو، تو قوالی دین کے علاوہ ہے۔ اسی طرح خانقاہیں ہیں۔ وہاں سجادہ نشین بیٹھے ہوں گے۔ آپ ان کے پاس جائیں۔ انہیں کہیں کہ اس وقت یہ ملکی ضرورت ہے۔ حالات کی ضرورت ہے۔ وہ آپ کو یہ جواب دیں گے یہ ہمارے بزرگ کی بیٹھک ہے۔ یہ ان کی چلہ گاہ ہے۔ یہ ان کا لنگر ہے۔ یہاں قوالی ہوتی تھی۔ ہم وہیں کرواتے ہیں۔ سارا کچھ وہی ہے۔ ہم نے تو سب کچھ قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ اپنے زمانے میں قائم رکھے ہوئے تھے، یہ اپنے زمانے میں اسے قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تبھی تو لوگ بیزار ہو کر آجاتے ہیں۔ مطلب تو یہ ہے کہ اس چیز کو موجودہ دور پر Apply کرنا ہے۔ تصوّف میں Application (اطلاق) زیادہ ہے جیسے سہیل عمر صاحب نے کہا تھا، وقتی طور پر جغرافیائی حالات اور تاریخی حالات، وہاں کے عوامل کے ساتھ تصوّف، زندگی کی طرح ہر چیز میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی آرڈر نہیں کرتا، بلکہ وابستہ ہو جاتا ہے۔

ادبِ لطیف:

سہیل عمر صاحب! آپ اس سلسلے میں کوئی اور سوال کریں گے؟

سہیل عمر:

واصف صاحب نے ابتدا میں تصوّف کی تعریف کے حوالے سے کہا تھا کہ تصوف اپنا Basic Data (اساسی مواد) وہی دیتا ہے جو شریعت کا ہے۔ البتہ اس میں اس کی نظر' اس کی گہرائی ذرا مختلف ہوتی ہے۔ دین کے جس طرح دو پہلو ہیں۔ تعلیم و تعلم اور دوسرا تصرف' محنت' توجہ کا۔ ایک آدمی جس طرح ظواہر دین سیکھتا ہے اسی طرح اس کی حقیقت بھی سیکھتا ہے۔ اگر وہ ظاہر میں نماز سیکھتا ہے تو حقیقت میں نماز بھی کسی سے سیکھنے جائے گا۔ ایک حکم ہوا۔ ایک Corresponding (مطابقت میں) کیفیت ہوئی محبت کی۔ تو جس طرح ہم کسی فوارے کے پاس کھڑے ہوں تو خود بخود پھوار مل جاتی ہے۔ اور جب صدیوں کے صحرا میں سے زندگی کا سفر گزرے تو پھر وہی نمی' فوارے سے دور ہونے کے سبب لن چھاگلوں میں رہ جاتی ہے جو انسان کے سینے میں ہوتی ہے۔

اب یہاں سے میں اس ابتدائی سوال کی طرف آنا چاہتا ہوں' جہاں سے "ادبِ لطیف" نے گفتگو کا آغاز کیا تھا کہ پچھلے بیس برس میں اس نمی کی تلاش کے لئے کچھ دلچسپی' کچھ فروغ زیادہ ہو رہا ہے تو کیوں ----؟ لوگوں کو اپنے کئے ..... کا احساس زیادہ ہونے لگا ہے ---- کیوں ؟

واصف علی واصف صاحب:

اب آپ اصل کی طرف آ جائیں۔ تصوّف آخر کیوں ----؟ کوئی چیز تو ایسی ہے جو اس کے بغیر حل نہیں ہوتی۔ چھوٹی سی بات ہے'

دو شخص بیک وقت یکساں طور پر نماز پڑھنے والے، دین میں چلنے والے، حج کرنے والے، ساری عمر اکٹھا رہنے والے ---- عین ممکن ہے ان میں سے ایک مسلمان ہو اور دوسرا منافق ---- منافقت جو کہ دین کے عمل میں شامل ہوتی ہے، منافقت کو سماج سے نکالنے کا واحد طریقہ تصوّف ہے اور چونکہ ہم منافقت سے ---- Oppressed (مغلوب) ہو گئے ہیں لہٰذا اس کا تصوّف کے بغیر کوئی چارا نہیں، کوئی راستہ نہیں، تو لوگ اِدھر چل پڑے۔ آستانے کی طرف لوگ چل پڑے، یہ جانتے ہوئے کہ اس کے پیچھے ایک بات ہے یعنی اپنے اندر صداقت پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ تصوّف ہی ایسا مقام ہے جہاں ہم منافقت کو ختم کر سکتے ہیں اور کوئی طریقہ ہی نہیں۔ کیونکہ منافقت وہی عمل کرے گی، جو دین والا کر رہا ہے۔ تصوّف جو ہے، اصلاحِ نیّت ہے اور منافقت سے بچنے کا طریقہ بھی ہے۔

اشفاق احمد:

ویسے بھی تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ایک عجیب تضاد ہے، وہ جو آستانے تھے وہ بڑے گڑھ بن گئے منافقت کے۔ میں خدانخواستہ کسی شخصیّت پر حملہ نہیں کر رہا۔

واصف علی واصف صاحب:

جی ہاں شخصیّت کی بات نہیں۔

اشفاق احمد:

وہ پھر منافقت کی طرف لوٹ گئے۔ اور وہاں صرف منافقت پھوٹتی

رہی۔

واصف علی واصف صاحب :

اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جس طرح نبوّت موروثی نہیں ہوتی' اسی طرح تصوّف بھی وراثت نہیں ہے۔ آستانوں کے اندر' صادق مشائخ کرام نے کسی نہ کسی طور پر اپنے جانشین مقرر کر دیئے۔ سجادگان اور خلفاء بھی آ گئے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کا جہاں ذکر آئے گا' بہت کم لوگوں کو پتہ ہو گا عثمان ہارونیؒ آپؒ کے مرشد ہیں۔ یعنی مرشد اتنا نمایاں نہیں ہوا جتنا مرید ہو گیا۔ داتا صاحبؒ کے مرشد کا کسی کو پتہ نہیں اور آپؒ اتنے اہم ہیں۔

سجادے کا مقرر کرنا یا خلیفے کا مقرر کرنا اس صفت کے بغیر' جو ان کے اپنے پاس تھی لہٰذا نتیجہ کیا نکلا؟

زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کا نشیمن

آستانہ بنانا' خانقاہ کے طور پر چلانا' یہ نظام اس طرح نہیں ہونا چاہئے۔ خانقاہی نظام اس طرح نہیں چلنا چاہئے۔ داتا صاحبؒ واحد فقیر ہیں جنھوں نے خانقاہی نظام میں Contribute نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی خلیفہ مقرر نہیں فرمایا تھا۔ بعد میں خانقاہ بن گئی ہو تو یہ دوسری بات ہے۔

ادبِ لطیف :

سہیل عمر صاحب' آپ سے ایک سوال ---- ابھی کچھ دیر پہلے شاہین صاحبہ نے بھی رہبانیّت کا ذکر کیا تھا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ بھی

سمجھا جاتا ہے کہ تصوّف بھی ترکِ دنیا ہے۔ اب کی صورتِ حال کا تو اندازہ نہیں' اب سے کچھ برس پیشتر اشفاق احمد صاحب نے کچھ ٹی وی ڈرامے لکھے تھے' جن میں انہوں نے بھی' اپنے ڈرامے کے ہیرو کو یوں دکھایا تھا کہ جب وہ سب طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو آ کر پیر کے ڈیرے پر بیٹھ جاتا ہے۔ یعنی جدّو جہد ختم اور سوچ لیا کہ جو کچھ ملنا ہے' اب یہیں سے ملنا ہے۔

تصوّف میں رہبانیّت سے ملتا جلتا جو تصوّف ہے' آپ اس کے متعلّق کچھ گفتگو کریں گے ؟

سہیل عمر:

اصولاً" تو یہ سوال اشفاق احمد صاحب ہی سے ہونا چاہئے تھا کہ انہوں نے اپنے جس کردار کو اس روپ میں پیش کیا' اس کا پس منظر کیا تھا اور ان کا کیا تجربہ یا کیا تصوّر تھا ---- باقی یہ سوال بہت پیچیدہ ہے۔ اس میں شخصی رجحانات ' طبیعتیں ہیں۔ بہت سارے لوگ جنہیں کوئی مایوسی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تصوّف کو اپنا لیں گے۔ اور کسی حد تک یہ بھی درست ہے کہ وہ مایوس ہو کر ادھر کا رخ کرتے ہیں اور یہ وہ دلیل ہے جو Orientalists آغاز سے اب تک تصوّف کے وجود کے بارے میں پیش کرتے رہے ہیں۔ زمانے کی ٹوٹ پھوٹ' سماجی حالات اور اس سے مایوسی وغیرہ وغیرہ۔

اپنے ذاتی تجربے اور مطالعے کے تحت میں تو کسی طرح اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ یہ بنیادی کشش کی وجہ ہے جو جاتی ہے تصوّف کی

جانب۔ یہ کسی کا شخصی تجربہ تو ہو سکتا ہے، اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ اور یہاں سے میں سوال واصف صاحب کی خدمت میں لوٹانا چاہوں گا کہ ان کی گفتگو میں سے ایک سوال ضمناً" یہ ابھرتا ہے جہاں خواجہ معین الدین چشتیؒ کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ ایک وسیلے کو خواجہ صاحبؒ نے وقت کی ضرورت کے پیش نظر اختیار کیا اور جب وہ ہٹ گئے، ضرورت ہٹ گئی تو وہ وسیلہ ایک کھوکھلی تکرار بن گیا۔ اور تاریخ میں ایسی چیزیں چلی آ رہی تھیں۔ وہ فیصلہ کن حد فاصل ہم کیسے کریں گے۔ یا انسانوں کو وہ درجہ یا مقام دینے کا کس طرح فیصلہ کریں گے۔ کہ جو سوانگ اور خول وقتی ضرورت اور عقلی ضرورت، اصل اور فرع دونوں کے درمیان فرق کرے؟

واصف علی واصف صاحب:

اس فرق کو بیان کرنے والا یا اس کی پہچان دینے والا ---- اس کو صاحبِ حال صوفی کہتے ہیں۔ یہ واقعہ چلتا آتا ہے۔ جہاں رکاوٹ آ گئی وہاں ایک اہل تصوّف آ گیا جو وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح دین محفوظ ہوتا رہتا ہے۔ اگر خالی تقلید رہ گئی، تو تحقیق سے بات چلی گئی۔ تحقیق بھی ہونی چاہئے۔ تحقیق ایسی نہ ہو کہ محبّت ختم ہو جائے اور تقلید ایسی نہ ہو کہ تحقیق ختم ہو جائے۔ اس لئے وہ آ کر بار بار بتلاتے رہتے ہیں۔ یہ آپ تصوّف والے بھی جانتے ہیں کہ خالی قوالی منشائے اسلام نہیں ہے۔ اسی طرح خالی نعت کہنا بھی منشائے اسلام نہیں ہے۔ یہی کچھ آپ کی اسلام پسندی کا ثبوت نہیں ہے، بالکل اسی طرح خالی شریعت کا نافذ کر دینا بھی اسلام نہیں ہے۔ اس کے ساتھ زندگی بھی نافذ ہونی چاہئے۔

محبت نافذ ہونی چاہئے۔ کچھ حقوق نافذ ہونے چاہئیں۔ کچھ اور آسانیاں بھی نافذ ہونی چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ حد فاصل کا فیصلہ کون کرے گا۔ وہ فیصلہ کرنے والا ہی تو صاحبِ حال ہوتا ہے۔ وہی تو وقت کا صوفی ہوتا ہے جو بتاتا ہے کہ سماج میں یہاں دراڑ آگئی' یہاں ٹوٹ پھوٹ ہو گئی' اس چیز کو یہاں روک دیا جائے جیسے پرانے زمانے سے لوگ چلے آرہے ہیں جو اپنے دور میں نشان دہی کر لیتے ہیں کہ یہاں سے یہ واقعہ گزر رہا ہے' اسے یہاں سے لے کر نکل جاؤ۔ تو جو درویش وقت کی ڈیوٹی پر ہو گا وہ بتائے گا کہ اس کو ایسے کر لینا چاہئے۔ وہی حدِ فاصل طے کرتا ہے۔

ادبِ لطیف:

اشفاق صاحب' ایک سوال کا گیند عمر صاحب نے آپ کی کورٹ میں پھینک دیا ہے کہ آپ کے ڈرامے کے ایک کردار کے حوالے سے ترکِ دنیا کا تصوّر ابھرتا ہے

اشفاق احمد:

میں ذاتی طور پر ترکِ دنیا کو برا نہیں سمجھتا' اگر کوئی کر سکے تو دنیا کے ساتھ اتنے وابستہ رہنا' جتنے کہ ہم ہیں یہ بھی کوئی خوبی کی بات نہیں۔ چونکہ میں اس پر ایک لمبی سی تحریر لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں آپ کو کام کی باتیں تو نہیں بتا سکوں گا ورنہ میری تحریر پھسپھسی ہو جائے گی۔

ترکِ دنیا کا تاریخی طور پر خدا جانے یہ شوشہ کہاں آگیا کہ یہ

رہبانیّت ہے۔ ہمارا کام تلوار لے کر لڑتے جانا اور بزنس کرتے جانا، اور لوگوں کو ایکسپلائٹ کرتے جانا یہ بہت خوبی کی بات ہے۔ دنیا کے ہر ذہن میں وہ کتنا بھی پاکیزہ، اچھا اور مفرح قسم کا کیوں نہ ہو، دنیا سے تعلّق رکھتا ہو تو اس میں استحصال کا عنصر ضرور آئے گا اس لئے آپ کی زندگیوں میں بھی جب کبھی صاحبِ دل، اہلِ دل اور اہل نظر لوگ آئیں گے اور اللہ آپ کو یہ صلاحیّت دے گا کہ آپ انہیں غور سے دیکھ سکیں تو آپ یہ محسوس کریں گے کہ یہ دنیا کے پیچھے بھاگنے والا آدمی نہیں۔ دنیا کو پسند کرتا ہے خوب صورت سمجھتا ہے اور وہ اس حوالے سے خوب صورت سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں اللہ نے اپنا قرآن نازل کیا۔ اسی دنیا میں خدا نے پیغمبر بھیجے۔ اس سے خوب صورت تو کوئی کرّہ ہے ہی نہیں۔ اسی لئے دنیا کو پسند کرتا ہے۔ لیکن یہ کہ میں اس سے منفعت حاصل کروں اور جتنی آسانیاں ہیں وہ مجھے ہی ملتی جائیں، یہ بات نہیں، تو تارکِ دنیا ہونا ہرگز، بالکل اتنا برا نہیں جتنا کہ مغرب سے لے کر مشرق کے فلسفیوں نے بتایا اور اگر میرا کوئی معمولی درجے کا کردار جاتا ہے تو وہ اس بات کی ترجمانی کرتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ میں ہوں، اللہ کی طرف سے ہوں اور اب میں اس مقام پر پہنچ چکا ہوں کہ میں تجویز کرنے سے عاری ہوں۔ میں تجویز نہیں کروں گا اور میں بہت خوش ہوں گا کہ آج بہت زیادہ گرمی ہے تو یہ علیم مطلق کی عطا کردہ ہے۔ سردی بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔

باقی کھانا پینا، روٹی پانی، یہ تو اللہ دیتا ہی جاتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ یہ جو برانڈرتھ روڈ کے لوگ ہیں یہ بہت اچھے لوگ ہیں،

تارک الدنیا کے مقابلے ہیں۔ یا شاہ عالمی کے لوگ' یا بہت زیادہ کوشش کرنے والے لوگ' یا لاٹ صاحب کے دفتر کے لوگ' تو میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں تارک الدنیا بہت اچھا انسان بھی ہے اور بہت اعلیٰ پائے کا صوفی بھی۔

سہیل عمر:

کیا اس ساری بحث سے جو لوگوں میں چلتی ہے' ترکِ دنیا اور حب دنیا کی' کیا اس کے پیچھے آج کل ایک کنفیوژن یہ نہیں کہ ترکِ دنیا کرنے والا' جس معنی میں بھی وہ کر رہا ہے' جو عمل اس کا ہے اسے دوسرے حضرات عمل نہیں سمجھ رہے۔ وہ ان کے خیال میں عمل نہیں۔ کیا یہ کنفیوژن اس کے پیچھے ہے؟

اشفاق احمد:

سو فی صد ---- بالکل سو فی صد۔

شاہین رائے:

ترکِ دنیا کے سلسلے میں اشفاق صاحب سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ترکِ دنیا کا اگر ہم یہ مطلب نہ لیں کہ دنیا چھوڑ کر جنگلوں کو نکل جانا' بلکہ آرام کی جو خواہش ہے یا جو اپنی خواہشات میں زندہ رہنے کے علاوہ ہیں ان کو کسی طرح سے دبانا ---- جیسے واصف صاحب اکثر فرماتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو طرز زندگی تھی وہ اس زمانے کے غریب ترین انسان سے بھی نیچی تھی۔ انؐ کا رتبہ تو جو ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ تو کیا یہ بھی ترکِ دنیا ہے۔

میں تو سمجھتی ہوں کہ ترکِ دنیا کرنے والا وہ ہے جس نے خواہش، خواب اور خیال کو ترک کر دیا ہو اور پھر بھی وقت کی نبض پر اس کا ہاتھ ہو یا کوئی شخص جو کچھ بھی کرے، وہ اپنے لئے نہ کرے۔ بلکہ دوسروں کو منفعت پہنچانے یا فیض پہنچانے کے لئے کرے۔

اشفاق احمد:

لیکن وہی شخص اگر جنگل میں چلا جائے اور لوگوں سے بالکل نہ ملے، اور لوگوں کے لئے دعا کرے، تو آپ تو اسے راہب کہیں گے، تارک الدنیا کہیں گے، میں اسے ہرگز تارک الدنیا نہیں کہتا جو لاکھوں لوگوں کے لئے بیٹھا دعا کر رہا ہے۔

سہیل عمر:

یہیں سے پھر میری بات سامنے آتی ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے، اس کی اہمیّت ہے بلکہ کیا چند ایسے لوگ نہیں ہونے چاہئیں۔

واصف علی واصف صاحب:

جو شخص جنگل میں جا رہا ہے اور صاحبِ حال ہے، کچھ عرصے کے بعد اس کے پاس بھی میلہ لگنا شروع ہو جائے گا اور کچھ عرصہ بعد وہاں بھی خانقاہ بن جائے گی۔ تارک الدنیا سے مراد یہ ہے، میرے خیال میں کہ وہ انسان طالب دنیا نہ ہو، مال کی محبت میں مبتلا نہ ہو، اور آسائش وجود میں مبتلا نہ ہو۔ دنیا میں رہ کر بھی وہ تارکِ دنیا ہو گیا۔ اگر ہم Define کریں (واضح کریں) کہ تصوّف کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دوسرے انسانوں کے لئے بے ضرر ہو جانا، اور اس کا پھر لوگوں کے لئے

منفعت بخش ہو جاتا تو لوگوں کے لئے ہی جب کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے تو
پھر یہ شخص تارکِ دنیا ہو ہی نہیں سکتا' ممکن ہی نہیں۔ نہ سوچ الگ ہو
سکتی ہے' نہ وجود الگ ہو سکتا ہے' نہ ہمارا غم الگ ہو سکتا ہے' نہ خوشی
الگ ہو سکتی ہے۔ نظر ہماری ----- نظارہ دنیا ----- تارک الدنیا
کیسے ہو گیا۔ تو ہماری ساری ٹریننگ اسی دنیا کے اندر ہے' تارک الدّنیا تو نا
ممکنات کا نام ہے۔

اشفاق احمد:

جو شخص بہت بڑا استحصال پسند ہے وہ تارکِ دنیا کہلا سکتا ہے۔ جو
بلیک مارکیٹنگ کرتا ہے' جو رشوت خور ہے' جو ظالم ہے' وہ تارک الدنیا
ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کو گزند پہنچانے کے خوف سے گریز کر کے چھپ
کے بیٹھا ..... ابھی منزل پر نہیں پہنچا' تو میں سمجھتا ہوں اس سے بڑا نیک
اور با عمل کوئی نہیں۔

واصف علی واصف صاحب:

داتا صاحبؒ ایک جگہ فرماتے ہیں وہ شرابی جو شراب خانے میں
لوگوں کے لئے بے ضرر ہو چکا ہے' وہ اس عالمِ دین سے بہت بہتر ہے جو
مسندِ رسالت پر کھڑا ہو کر طالبِ دنیا ہے۔

(حاضرین کی مشترکہ طور پر واہ واہ اور سبحان اللہ۔)

اشفاق احمد:

واہ! بڑوں کی بڑی بات ہے!

ادبِ لطیف:

اگر کوئی اور سوال نہ ہو تو ہمارا خیال ہے' اسی دو ٹوک' کھرے اور واضح استدلال کے بعد آج کی گفتگو کا اختتام کیا جائے۔

○

۲
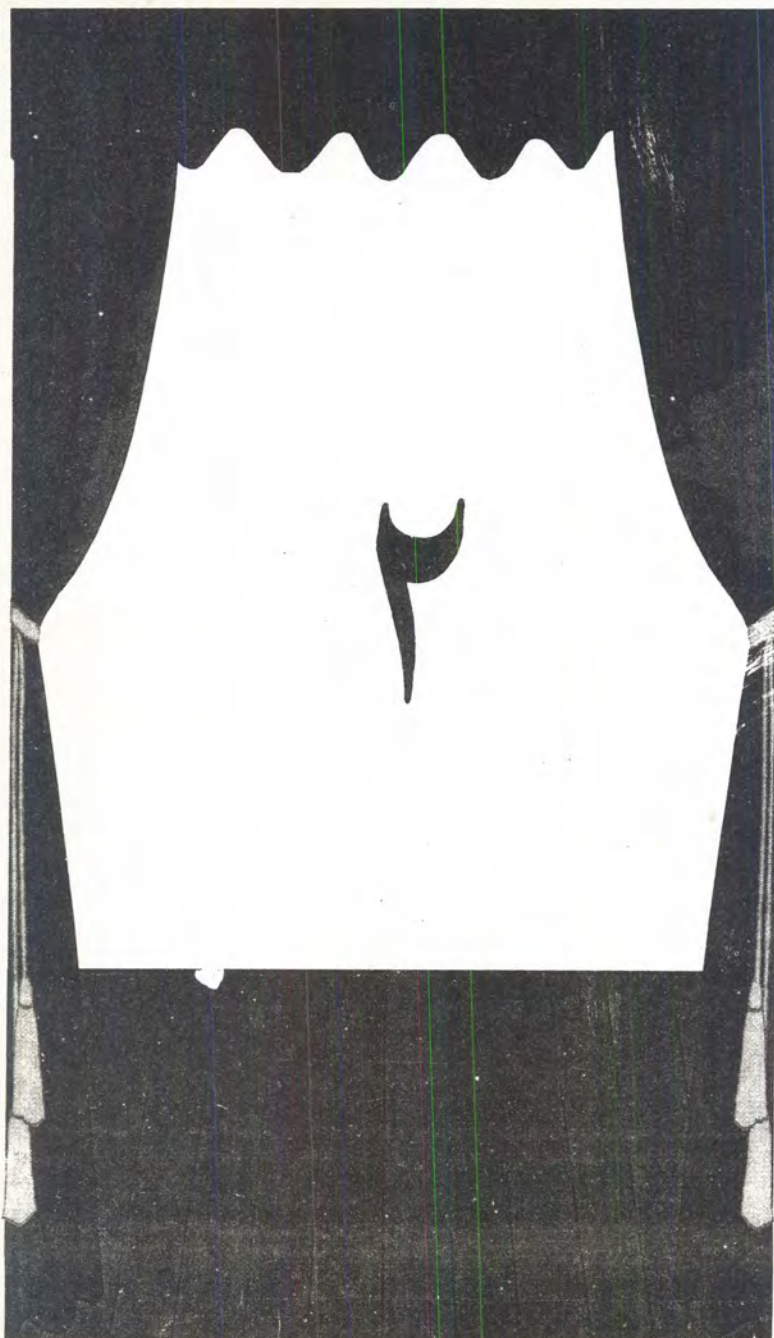
ریڈیو پاکستان لاہور سے ربیع الاوّل کی مناسبت سے سیرتِ طیبہ پر یہ پروگرام منعقد کیا گیا۔ اس تقریب کی کمپیئرنگ محترم عبدالجبار شاکر نے کی۔ سب سے پہلے قاری محمد عارف علوی کو تلاوتِ کلام پاک کی دعوت دی گئی۔ پھر نذیر حسین نظامی نے نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پیش کی۔ صدارت جناب ڈاکٹر یوسف گورایا نے کی۔ اس تقریب میں جناب واصف علی واصف صاحبؒ نے "خیرِ مجسّمؐ ---- مکارمِ اخلاق کی تکمیل" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس مختصر و محدود وقت میں سیرتِ طیبہ کے تقریباً ہر پہلو پر جس صراحت سے روشنی ڈالی گئی وہ واصف صاحبؒ کا اپنا خاصّہ ہے۔ تقریب کے آخر میں شرکاءِ تقریب نے سوالات کیے جن کا واصف صاحبؒ نے اپنے خاص اسلوبِ مکالمہ سے نہایت خوب صورتی سے جواب دیا۔

خیرِ مجسّم ﷺ ۔ مکارمِ اخلاق کی تکمیل

کمپیئر:۔ عبدالجبار شاکر

تلاوتِ کلامِ پاک :۔ قاری محمد عارف علوی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ :۔ نذیر حسین نظامی

سوالات کرنے والے :۔

عابد عباس

مرید مرزا

خرم امین

ارم صاحبہ

صدارت :۔ ڈاکٹر محمد یوسف گورایا

مقالہ نگار :۔ واصف علی واصف صاحب

☆☆☆

عبد الجبار شاکر :۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ربیع الاول کے حوالے سے پروگرام خیرِ مجسم ﷺ کی دسویں نشست کے ساتھ عبد الجبار شاکر حاضرِ خدمت ہے۔ آج کی اس نشست کی صدارت معروف سکالر جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایا صاحب کریں گے۔ آج کا موضوع ہے "خیرِ مجسم ﷺ۔۔

مکارمِ اخلاق کی تکمیل" اس موضوع پر آج کے مقالہ نگار معروف دینی دانشور جناب واصف علی واصف صاحب ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اس موضوع پر اپنا خصوصی مقالہ پیش کریں۔

واصف علی واصف صاحب :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ معزز سامعین۔ السلام علیکم۔

حکمائے عالم نے سب سے بڑے اخلاق کے بارے میں دنیا کو جو معیارِ اخلاقیات دیا' وہ سب انسانوں کا تصوّر ہے اور انسانی تصوّر میں نفس کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جو معیار اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا' وہ ہر خامی سے آزاد ہے۔ خالق ہی بہتر جانتا ہے کہ مخلوق کے لئے کون سا معیارِ اخلاق بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کی ذات میں یہ فیصلہ فرما دیا کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔

اس کے بعد اخلاق کا بہترین نمونہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ تکمیل انسانیت کا نقطۂ عروج حضورؐ کی ذات اقدس ہے۔ تکمیلِ ذات میں تکمیلِ اخلاق کا دعویٰ اپنی تکمیل کے ساتھ موجود ہے۔ ذات کامل ہو تو صفت مکمل ہو جاتی ہے۔ ذات اور صفات کا رشتہ عجب ہے۔ کبھی صفت ذات کی پہچان ہے اور کبھی ذات صفت کی۔ مثلاً" اگر صفت صداقت ہے تو ذات صادق ہی کہلائے گی لیکن اگر ذات حضور اکرمؐ کی ہو تو آپؐ ایسے صادق ہیں کہ آپؐ جو بھی فرمائیں' وہی صداقت ہے۔

آپؐ کی ذاتِ گرامی اتنی مکمل ہے کہ آپؐ کے دم سے ہی صفات کی تکمیل ہوئی' صفات کو مرتبہ ملا' صفات کو تقدس ملا' پہچان ملی' عروج ملا۔ ایک عام آدمی سچ بولے تو ہم اس سچ کی تحقیق کر سکتے ہیں عقل کے

ذریعے سے، مشاہدے کے ذریعے سے۔ لیکن ایک پیغمبر اور خاص طور پر حضور اکرمؐ کی صداقت ہماری تحقیق سے بلند و ماورا ہے۔

حضور اکرمؐ نے زندگی کے معاملات میں جو بھی ارشاد فرمایا، وہ صداقت ہے کیونکہ ان کا مشاہدہ موجود تھا۔ لیکن کمال صفت تو یہ ہے کہ آپؐ نے اللہ کریم کے بارے میں اور مابعد کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا، وہ ہماری تحقیق میں نہ آسکنے کے باوجود صداقت ہے، بلکہ صداقتِ مطلق ہے اور کمال صفت کا یہ اعجاز ہے کہ ہم آپؐ کی ہر بات کو تحقیق کے بغیر تسلیم کرنے کو اپنا ایمان بلکہ سرمایۂ ایمان سمجھتے ہیں۔

آپؐ سے پہلے پیغمبروں میں رسالت کا رنگ مخصوص اور جزوی تھا۔ آپؐ کی شخصیت میں رسالت اپنے انتہائی رنگ سے ایسی مکمّل ہوئی کہ اس کے بعد کسی رسول کی ضرورت ہی نہیں۔ یعنی آپؐ نے اخلاق کو اس درجہ مکمل فرمایا کہ اس کے بعد کسی اور تفصیل کی ضرورت ہی نہیں۔ آپؐ نے انفرادی اور اجتماعی اخلاق میں وہ انقلاب پیدا فرمایا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

حضور اکرمؐ کی تعلیم کا نتیجہ تاریخ نے دیکھا کہ آقا پیدل چل رہا ہے اور غلام سوار ہے۔ آپؐ کے دم سے گویا اخلاق اور صفات کو سند عطا ہوئی۔ آپؐ کے اخلاق کی یہ تاثیر ہے کہ آپؐ جب ارشاد فرماتے تو سامعین سر جھکا کر اور خاموش ہو کر یوں سنتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ آپؐ کا حسنِ اخلاق یہ ہے کہ آپؐ نے جس کو دفعتاً" دیکھا، وہ مرعوب ہو گیا۔ جو آپؐ سے آشنا ہوا، وہ محبت اور ادب کرنے لگ گیا۔ آپؐ نے اخلاق کو تکمیل کا وہ درجہ عطا فرمایا کہ ایک

طرف تو اللہ اور اللہ کے فرشتے آپؐ پر درود بھیجتے ہیں اور دوسری طرف آپؐ کے جانثار آپؐ کی خدمت میں آج تک درود و سلام اور نعت کا ہدیہ پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ اپنے تو اپنے' بیگانے بھی آپؐ کو عقیدت کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ آج بھی چودہ سو سال کی دوری کے باوجود آپؐ دلوں کے قریب ہیں۔

آپؐ کی ذاتِ اقدس میں جہاں اللہ کریم نے انسانیّت کی تکمیل فرمائی' نبوّت کی تکمیل فرمائی' وہاں اخلاقِ جلیلہ کی تکمیل بھی فرما دی۔ آپؐ کا کردار' کردار کی انتہا ہے۔ آپؐ کا ارشاد' ارشاد کی انتہا ہے اور آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب آسمانی کتب کا حرفِ آخر۔ آپؐ کے اخلاقِ عالی کا یہ مقام ہے کہ اسے صداقت نبوّت کے لیئے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا۔ سورۃ یونس میں ارشاد ہے کہ "میں نبوّت سے پہلے تم لوگوں میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں' کیا تم سمجھتے نہیں"۔ گویا اعلانِ نبوّت سے پہلے آپؐ کی چالیس برس کی تمام عمر بھی مرقّعِ اخلاق ہے۔

نبوّت اخلاق کا نتیجہ نہیں' اخلاق نبوّت کی عطا ہے اور نبوّت اور پھر آپؐ کی نبوّت' کمالِ عطائے الٰہی ہے۔ جب اللہ کریم اپنے حبیبؐ کو اخلاق کا معیار بنا کر پیش کرے تو وہ اخلاق کتنا مکمل ہو گا' اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ دراصل اخلاق ایک ایسی راہِ عمل ہے' جس پر چلنے والے انسان کا کردار مخلوقِ خدا کے لیئے بے ضرر اور منفعت بخش ہوتا ہے۔ انسانی سوچ اخلاق کا جو معیار دیتی ہے' وہ قابلِ تاثیر ہو سکتا ہے لیکن جب پیغمبر اخلاق کا معیار دے تو وہ معیار خدا کی طرف سے ہوتا ہے اور خالق بہتر جانتا ہے کہ مخلوق کے لیئے کون سا کردار بہتر ہے۔

حضور اکرمؐ کے اخلاق کے بیان کے بارے میں جہاں تاریخ گواہ ہے، وہاں قرآن بھی شاہد ہے کہ "اے پیغمبرؐ! تم اعلیٰ اخلاق پر پیدا ہوئے"۔ حضورؐ کا اپنا ارشاد تکمیلِ اخلاق کے ضمن میں ایک مینارۂ نور کی طرح درخشاں ہے۔ ارشاد ہے "میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیئے بھیجا گیا ہوں"۔ اور یہ کہ "میں تو اسی لیئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارمِ اخلاق کا معاملہ تکمیل تک پہنچاؤں"۔ شاید ہی کوئی ایسی اخلاقی صفت ہے جس کے اپنانے کی آپؐ نے تلقین نہ فرمائی ہو، جس پر آپؐ نے خود عمل کر کے نہ دکھایا ہو۔ آپؐ نے زندگی کو اخلاق کی تفصیل اور تکمیل بنا دیا۔

آپؐ محافظِ اخلاق ہیں، مفسّرِ اخلاق ہیں، مظہرِ اخلاق ہیں، منبعِ اخلاق ہیں، مجسّمِ اخلاق ہیں، بلکہ مکمل اخلاق ہیں۔ آپؐ کی اخلاقی رفعتوں کا بیان دراصل آپؐ کی پوری سیرت کا بیان ہے۔ اخلاق کی جزئیات میں آپؐ کے ہاں استقامتِ عمل ہے، حسنِ سلوک ہے، حسنِ معاملہ ہے، عدل و انصاف ہے، جود و سخا ہے، ایثار ہے، مہمان نوازی ہے، سادگی اور بے تکلفی ہے، شرم و حیا ہے، عزم و استقلال ہے، شجاعت ہے، صداقت ہے، امانت ہے، ایفائے عہد ہے، زہد و تقویٰ اور قناعت ہے، عفو و رحم ہے، کفار اور مشرکین سے حسنِ سلوک ہے، غریبوں کے ساتھ محبت ہے، حیوانات اور پرندوں پر رحم ہے، رحمت و محبت عام ہے، رقیق القلبی ہے، عبادت و تعزیت ہے، اولاد سے محبت ہے، غرضیکہ حسنت جمیع خصالہ۔

آپؐ کے بارے میں کیا لب کشائی کی جا سکتی ہے۔ آپؐ کے اخلاق اور اوصاف کا ذکر احادیث اور سیرت کی کتابوں میں بڑی تفصیل

سے کیا گیا ہے۔ آپؐ کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اخلاق و اوصاف کی تفسیر نظر آتا ہے۔ آپؐ کے اخلاق میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ آپؐ نے جس اخلاق کا پرچار کیا' اس پر مکمل طور پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ آپؐ کی ذاتِ اقدس تمام انبیائے کرام اور مصلحینِ عالم میں واضح طور پر اس لیئے ممتاز ہے کہ آپؐ کا عمل آپؐ کے علم کا شاہد ہے۔ حدیثِ نبویؐ اور سنّتِ نبویؐ میں تطابق ہے۔

آپؐ کا کمال اخلاق یہ ہے کہ وہ دور جس میں صداقت' دیانت اور امانت کے چراغ گل ہو چکے تھے' آپؐ نے اپنے پاکیزہ کردار سے اس دور میں "الصادق" اور "الامین" کے القاب حاصل کئے اور وہ بھی مخالفین سے۔ آپؐ کے قریب رہنے والے سبھی لوگ بہ یک زبان یہ کہتے کہ آپؐ نہایت نرم مزاج' خوش اخلاق اور نیک سیرت تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی برائی کے بدلے میں برائی سے کام نہیں لیا۔ آپؐ ہمیشہ درگزر فرماتے' معاف فرما دیتے۔ آپؐ نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ آپؐ نے کبھی کسی کو بات کرنے کے دوران ٹوکا نہیں۔ آپؐ خندہ جبیں' نرم گفتار اور مہربان تھے۔

آپؐ پر جب پہلی بار وحی نازل ہوئی تو آپؐ نزولِ وحی کی شدّت سے گھبرائے اور آپؐ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپؐ نے گھبرا کر رفیقۂ حیات سے اپنی کیفیّت کا ذکر فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور آپؐ کے اخلاق کے بارے میں یہ کہا "ہر گز نہیں خدا کی قسم! خدا آپؐ کو کبھی اندوہ گیں نہ کرے گا آپؐ عزیزوں اور رشتے داروں سے حُسنِ سلوک کرتے ہیں ناتواں' بے کسوں اور

غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں جس کے پاس کچھ نہیں ہوتا' اسے دیتے ہیں مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں' مصائب میں حق کے معاون اور مددگار ہیں آپؐ میں وہ تمام صفات ہیں اور آپؐ صادق القول ہیں"۔

آپؐ کے قبل نبوّت کے اخلاق کا گواہ حضرت خدیجہؓ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ آپؐ داعیٔ حق ہونے کی حیثیّت سے اپنی تعلیم کا افضل و اعلیٰ نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انسانی زندگی کے لئے جس انسانی اخلاق کی تعلیم فرمائی' اس کا عملی مظہر سرکارؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ حضور اکرمؐ کو اس بات کی پوری آگہی تھی کہ آپؐ کو دنیا کے لئے معلّمِ اخلاق بنا کر بھیجا گیا ہے۔ آپؐ کے اعمال اور آپؐ کے اقوال اس بات کا مکمّل ثبوت ہیں۔ اخلاق کی تکمیل آپؐ کے دم سے ہوئی۔

آپؐ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ "کامل انسان اور کامل ایمان اس مومن کا ہے' جس کا اخلاق اچھا ہے۔ اعمال کے ترازو میں حُسنِ خلق سے بھاری کوئی نیکی نہیں۔ انسان حسنِ اخلاق سے عبادت کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں"۔ حضور اقدسؐ سے ایک مرتبہ سوال کیا گیا کہ "کون سی نیکی بہتر ہے؟" آپؐ نے فرمایا کہ "کھانا کھلانا اور سب کو سلام کہنا یعنی سب کو سلامتی کی دعا کا پیغام پہنچانا"۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے ایک مرتبہ اپنے کسی غلام کو برا بھلا کہا۔ حضور اکرمؐ نے سن لیا۔ فرمایا "ابو ذر' ابھی تم میں جہالت باقی ہے' غلام تمہارے بھائی ہیں' اللہ نے انہیں تمہارے ماتحت کیا ہے' جس کا بھائی ماتحت ہو' اسے چاہئے کہ بھائی کو ویسا کھانا کھلائے جیسا آپ کھائے' ویسا

ہی پہنائے جیسا آپ پہنے' بھائی سے ایسا کام نہ لے جو اس سے نہ ہو سکے' کوئی سخت کام ہو تو اس کی مدد کرے"۔

حضورؐ کے اخلاقِ عالی میں حسنِ سلوک کو بڑی اہمیت ہے۔ آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا "قسم ہے وہ ایمان نہیں لایا' خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا' خدا کی قسم وہ ایمان نہیں لایا"۔ صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! کون؟" آپؐ نے فرمایا "جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہیں"۔

آپؐ کی زندگی کے واقعات اور آپؐ کے ارشادات میں ایسے ہزارہا پہلو سامنے آتے ہیں' جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے تشریف لائے۔ کون سی ایسی خوبی ہے جو آپؐ کی ذات میں موجود نہ ہو۔ آپؐ نرم مزاج تھے' خوش گفتار تھے' متین تھے' حلیم الطبع تھے۔ کسی کی دل آزاری نہ فرماتے۔ آپؐ کی مجلس میں نئے آنے والوں کو جگہ نہ ملتی تو آپؐ ردائے مبارک بچھا دیتے۔ بچوں پر تو آپؐ اس حد تک شفیق تھے کہ مشرکوں کے بچوں پر بھی رحم کرنے کا آپؐ نے حکم فرمایا۔ غلاموں پر آپؐ کی شفقت کا یہ عالم تو اس بات سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ آج بھی آپؐ کی غلامی ہی سرفرازی کا ذریعہ ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ غریبوں اور بے کسوں سے عملی ہمدردی کا اظہار فرمایا۔ آپؐ نے دنیا میں مساوات کا اعلیٰ ترین نمونہ قائم کیا۔ فتح مکہ کے بعد آپؐ کا ارشاد ہے "اے گروہ قریش! اللہ نے جہالت کا غرور اور نسب کا افتخار مٹا دیا۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے"۔ اور خلق کا یہ عالم ہے کہ آپؐ کے پاس خُلقِ عظیم ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ "ہر دین کا

خلق ہوتا ہے اور اسلام کا خلق حیا ہے"۔

آپؐ کے پاس جو صفت بھی موجود ہے، دائم ہے۔ آپؐ دائم الرضا ہیں، دائم الزہد ہیں، دائم الشوق ہیں، دائم الصبر ہیں، دائم الصدق ہیں، دائم الامر ہیں، دائم الفکر ہیں۔ غرضیکہ آپؐ ہمہ صفت موصوف ہیں۔ حسن آپؐ کی صفت ہے اور صفت آپؐ کا حسن۔ آپؐ ہمیشہ ہشاش بشاش رہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف اور اللہ کی محبت نے آپؐ کو دنیا کے خوف اور محبت سے آزاد کر دیا۔ حضرت سعد بن ہشامؓ سے روایت ہے کہ آپؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ "اے ایمان والوں کی ماں! حضور اکرمؐ کے اخلاق کے بارے میں کچھ بتائیں" تو آپؓ نے فرمایا کہ "تم نے قرآن نہیں پڑھا"۔ انہوں نے کہا "قرآن تو پڑھا ہے"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ "حضور اکرمؐ کا خلق قرآن تھا"۔ یعنی آپؐ قرآن مجسم تھے۔ آپؐ کا اخلاق ہی منشائے قرآن کے عین مطابق ہے۔ قرآن کو پڑھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرآن جس اخلاق کی تعلیم دے رہا ہے، وہ حضورؐ ہی کا اخلاق ہے اور حضورؐ کی زندگی اور آپؐ کے اخلاق کو دیکھیں تو یوں نظر آتا ہے کہ آپؐ کا اخلاق قرآن ہی کا اخلاق ہے۔ اللہ کا پسندیدہ اخلاق آپؐ کی ذات میں اور آپؐ کا اخلاق اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں موجود ہے۔ اسی لئے آپؐ کے اخلاق کی پیروی ہی رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے۔

اخلاقیات کے تمام مکاتیبِ فکر اس بات پر متفق ہیں کہ رحم، اخلاق کی اعلیٰ صفت ہے اور حضورؐ کی ذاتِ مبارکہ میں رحم اور رحمت کا یہ عالم ہے کہ آپؐ کے بارے میں ارشاد ہے و ما ارسلنٰک الا رحمۃ

اللعالمین ۔ کہ آپؐ تمام مخلوق کے لیئے رحمتِ مجسّم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اپنا' بیگانہ' مؤمن' کافر' چرند' پرند' ذی جان' بے جان' مرئی یا غیر مرئی' کوئی مخلوق ہو آپؐ کی رحمت کا سایہ سب کے لیئے ہے اور ہمیشہ کے لیئے ہے۔ آپؐ کو جب بھی کسی نے کفار پر لعنت بھیجنے کے لیئے کہا' آپؐ نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ "میں لعنت کے لیئے نہیں' رحمت کے لیئے بھیجا گیا ہوں"۔ روایت ہے کہ حضور اقدسؐ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا' آپؐ کے رعب و جمال سے کانپنے لگا' آپؐ نے فرمایا "اپنے آپ کو سنبھال' میں کوئی بادشاہ نہیں' میں تو قریشی ماں کا بیٹا ہوں' جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی"۔

آپؐ لغزشوں کو معاف فرمانے والے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "میں نے حضورِ اقدسؐ کی خدمت کی ہے۔ میں نے کبھی آپؐ کو یہ کہتے نہیں سنا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ غلاموں کے ساتھ شفقت کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ! غلاموں کا قصور کتنی دفعہ معاف کریں"۔ آپؐ خاموش رہے۔ اس نے جب تیسری مرتبہ یہی گزارش کی تو آپؐ نے فرمایا "ہر روز ستّر مرتبہ"۔ حضور اقدسؐ اکثر دعا فرمایا کرتے تھے کہ "اے اللہ! مجھے مسکین زندہ رکھ' مسکین اٹھا' مسکینوں ہی کے ساتھ میرا حشر ہو"۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا "یہ کیوں؟" آپؐ نے فرمایا "اس لئے کہ مسکین دولت مندوں سے پہلے جنت میں جائیں گے"۔

آپؐ کی روزمرہ کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ آپؐ میں تکلّف اور تصنّع کا سایہ تک نہ تھا۔ نماز' خوراک' رہائش میں ہمیشہ سادگی سے کام

لیتے۔ امارت اور فضولیات آپؐ کو ناپسند تھیں۔ واقعہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے نیا مکان بنوایا، جس کا گنبد بلند تھا۔ آپؐ نے دیکھا تو پوچھا "یہ مکان کس کا ہے؟" لوگوں نے نام بتایا۔ آپؐ چپ رہے۔ اور وہ شخص جب حسبِ معمول آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر سلام کیا، آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ناراضگی کی کیا وجہ ہے۔ جا کر گنبد کو زمین کے برابر کر دیا۔ آپؐ نے جب دوبارہ مکان دیکھا تو ارشاد فرمایا "ضروری عمارت کے سوا ہر عمارت انسان کے لئے وبال ہے"۔

ایک دفعہ آپؐ ایک چٹائی پر آرام فرما رہے تھے۔ اٹھے تو لوگوں نے دیکھا کہ پہلوئے مبارک پر نشان پڑ گئے ہیں۔ عرض کیا "یا رسول اللہؐ! ہم لوگ کوئی گدا منگوا کر حاضر کریں"۔ آپؐ نے فرمایا "مجھ کو دنیا سے کیا غرض، مجھے دنیا سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا اس سوار کو جو تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے"۔ آپؐ نے سادہ زندگی کو ہی بلند خیالی کے لئے لازمی قرار دیا۔

دنیا کے تمام مفکّرینِ اخلاق نے آج تک جتنے بھی اخلاق کے اصول بنائے ہیں، آپؐ کی زندگی ان اصولوں کی مظہر ہے۔ آج کے زر پرست اور ہوس پرست معاشرے میں شاید یہ بات سمجھنا مشکل ہو کہ وہ انسان جو پیغمبروں کا امام ہو، اللہ کا محبوبؐ ہو، قبیلے کا سردار ہو، جسؐ کا نام لوگوں کے ایمان کا حصہ ہو، جسؐ کا علم دلوں پر جاری ہو، جسؐ کے اشاروں پر لوگ اپنی جان نثار کرنے کو سعادت سمجھتے ہوں، اسؐ انسان کے

جسمِ مقدس پر کوئی پیوند دار لباس ہو اور پیوند بھی اپنے دستِ مبارک سے لگائے ہوں۔ جس کو دولتِ معراج عطا ہو رہی ہے، عروج کی انتہا ہو رہی ہے، اس کی زندگی اتنی سادہ ہو کہ اگر حضرت عمرؓ دیکھیں تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں کہ قیصرو کسریٰ تو باغ و بہار کے مزے لوٹیں اور آپؐ اللہ کے پیغمبر ہوتے ہوئے اس حال میں زندگی بسر کریں اور پھر حضورؐ سادگی اور یقین سے یہ ارشاد فرمائیں کہ "اے عمر! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت"۔

حضور اقدسؐ نے اخلاق انسانی کو تکمیل کے اس درجے تک پہنچا دیا کہ یہ اخلاق آسمانی ہو کر رہ گیا۔ اللہ نے انسانوں کے لئے جو بھی اخلاق پسند فرمایا، وہ دراصل اخلاقِ محمدیؐ ہے۔ حضورؐ نے جس اخلاق کو پیش کیا وہ دراصل اللہ کا پسندیدہ اخلاق ہے۔ کوئی خوبی ایسی نہیں جو حضورؐ پُرنور میں نہ ہو۔ آپؐ ایفائے عہد میں اتنے بلند تھے کہ آپؐ تین دن تک ایک جگہ کھڑے رہے، ایک انصاری نے آپؐ سے ٹھہرنے کا وعدہ لیا اور وہ خود بھول گیا۔ تین دن کے بعد جب وہ وہاں سے گزرا، آپؐ کو دیکھا تو اسے یاد آیا لیکن آپؐ نے اس سے صرف اتنا کہا کہ تو نے مجھے بہت تکلیف دی۔

حضورؐ کے اخلاق کے بارے میں کیا کیا کہا جائے۔ آپؐ نے اللہ سے اسوۂ حسنہ کی سند لی، دنیا نے آپؐ کو معلّمِ اخلاق مانا، آپؐ پر نبوت کی تکمیل ہوئی، انسانیت کی تکمیل ہوئی اور اخلاق کی تکمیل ہوئی۔ آپؐ کی ذات کے بارے میں بس یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ ۔

سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان توں شاناں سب بنیاں

عبد الجبار شاکر:

اب میں سامعین کو دعوت دیتا ہوں' وہ جناب واصف علی واصف صاحب سے اپنے سوالات کر سکتے ہیں۔

عابد عباس:

میں واصف صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہمارے سامنے اخلاق کا بہترین نمونہ حضور پاک ﷺ کی ذات گرامی کی صورت میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہمارا معاشرہ روز بروز اخلاقی بے راہروی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

واصف علی واصف صاحب:

اس سوال کے اندر ہی جواب موجود ہے کہ ہمارا علم اسلام ہے' ہمارا علم حضور پاکؐ کے اخلاق ہیں' ہمیں معلوم ہے کہ آپؐ کے کیا اخلاق ہیں لیکن ہمارا عمل اس سے دور ہے۔ ہم نے اس علم کو اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کیا۔ یہ تو وجہ ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ آپ عمل کو ہی علم کہیں تو پھر وہ عمل جو اس علم کے مطابق ہو' ہم وہی عمل اختیار کریں تو پھر معاشرے کا درست ہونا مشکل نہیں ہے۔ مثلاً" ہم بار بار یہ کہتے ہیں کہ آپؐ غلاموں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک فرماتے تھے۔ تو آج کے انسان کو نوکروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہونا چاہئے۔ آپؐ نے اپنی دخترِ نیک اختر کی شادی فرمائی تو جو بھی جہیز کی صورت تھی'

تو آج کوئی ایسا انسان ہونا چاہئے جو اس معیار کے مطابق اپنی زندگی میں سادگی اختیار کر کے دکھائے۔ اس لئے ہمارے پاس علم تو آپؐ کی ذات کا ہے مگر ہمارا عمل اس کے مطابق نہیں۔ تو یہ جو Dichotomy یا خلیج ہے' اگر علم اور عمل کے درمیان یہ خلیج ختم ہو جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ معاشرہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

مرید مرزا:

میں یہ گذارش کرتا ہوں کہ واصف صاحب! کھانا کھلانے کی جو تاکید ہے' کیا اس میں غیر مسلم بھی شامل ہیں؟

واصف علی واصف صاحب :

جب حضور پاک ﷺ فرمائیں کہ سب کو کھلانا چاہئے تو پھر اس میں تخصیص نہیں۔ جو بھی بھوکا ہو اسے کھانا کھلایا جائے۔ دنیا میں جو شخص پیدا ہوا' اسے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ ایک بار جب ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگ جائیں' اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے لگ جائیں تو پھر مخلوق میں سے ہم کسی کے ساتھ غیر نہیں ہوتے۔ تو یہ حکم انسانی زندگی کے حوالے سے ہے۔ محتاج کی خدمت کی جائے اور غریب کو کھانا کھلایا جائے۔ کھانے سے کسی کو محروم نہیں کیا گیا' چاہے وہ دین پر ہو یا نہ ہو۔

خرّم امین :

میرا محترم واصف علی واصف صاحب سے یہ سوال ہے کہ آپ نے حضور پاک ﷺ کے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے بارے میں جو بتایا ہے تو آپ حضور پاک ﷺ کے خُلقِ عظیم کی وضاحت فرما دیں۔

واصف علی واصف صاحب :

میں نے اپنے مقالہ میں خلق عظیم کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ اسے یوں سمجھ لیں کہ جو صفت ہے وہ حضور پاکؐ میں کمال درجے کی ہے' اگر تواضع ہے تو کمال درجے کی ہے' اخلاق ہے تو کمال ہے' معاملات ہیں تو کمال ہے' اولاد سے تعلقات ہیں تو کمال کے ہیں' بچوں سے شفقت ہے تو کمال ہے' منصب ہے تو کمال ہے۔ غرضیکہ آپؐ کی زندگی کا ہر شعبہ ہی کمال ہے۔ اس لئے خلقِ عظیم کا منصب ہے تو کمال ہے۔

مطلب یہ ہے کہ آپؐ کے اخلاقِ عالی ہر لحاظ سے عظیم ہیں۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ جو علم ہے' وہی عمل ہے' تو آپؐ کی زندگی میں علم اور عمل میں کوئی فرق نہیں۔ جو آپؐ فرماتے ہیں وہی عمل فرماتے ہیں' جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھاتے ہیں۔ یہی آپؐ کی عظمت ہے اور یہی آپؐ کی عظمت کی انتہا ہے۔

ارم صاحبہ :

میرا جناب واصف علی واصف صاحب سے یہ سوال ہے کہ حضور پاکؐ کے اخلاق کو موجودہ دور میں کس طرح جاری و ساری کیا جا سکتا ہے؟

واصف علی واصف صاحب :

آپؐ کے اخلاق کو معاشرہ میں جاری و ساری کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آج کا مسلمان آپؐ کی زندگی اور آپؐ کے اخلاق کو اپنی

زندگی میں رائج کرنے کا اہتمام کرے' آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی فکر کرے اور آپؐ کے علاوہ جو راستے ہیں' ان پر چلنے کا جو فیشن سا ہو گیا ہے' اس سے گریز کرے۔ مسلمان اپنی زندگی کو حضور پاکؐ کی غلامی میں حاضر کر دیں تو موجودہ معاشرے میں وہ چیز رائج ہو سکتی ہے جو اسلام کا منشاء ہے۔ اسلام کو زندگی میں رائج کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے اسے دل میں رائج کیا جائے' اپنے وجود پہ رائج کیا جائے' اپنی روح پہ رائج کیا جائے' پھر معاشرے میں اسلام کا رائج ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ جب انسان کا باطن درست ہو جائے تو ظاہر درست ہو جاتا ہے اور معاشرہ خود بخود اِصلاح پکڑ لیتا ہے۔ آپ اسے حضور پاکؐ کا اعجاز ہی سمجھیں کہ آپؐ کے دم سے یہ معاشرہ درست ہو جائے گا' وہ محبت ہی ہمیں اطاعت سکھائے گی۔ اس محبّت ہی کے ذریعے ہم ایک اچھا اور فلاحی معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ آپؐ کے حکم کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں۔

والسلام۔ آپ سب کے لئے دعا ہے۔

○

۳

روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہونے والا یہ مکالمہ واصف صاحبؒ کے وسیع تعارف کا باعث بنا۔ ایم۔ اے۔ او کالج لاہور میں ایک فعال بزمِ اقبال موجود ہے جس کے زیرِ اہتمام گوناں گوں سرگرمیاں ہوتی رہتی ہیں۔ بزمِ اقبال اور ایوانِ وقت کے روحِ رواں محترم عطاء الحق قاسمی نے اس مکالمہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں بہت سی صاحبِ علم اور مؤقّر شخصیّات شامل تھیں جنہوں نے کماحقّہٗ واصف صاحبؒ کے علم و عرفان کے نور سے استفادہ کیا۔ اس مکالمہ میں قبلہ واصف صاحبؒ کا علم ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح ہے جو اپنے کناروں سے نکلا نکلا جاتا ہے۔ پورے مکالمہ کا ایک ایک فقرہ نہایت پُر تاثیر اور حیران کر دینے والے اقوالِ زریں کا مظہر ہے۔ یہ ایسا علم ہے جو عقل و خرد کو مبہوت کر دیتا ہے اور قلب و نظر کو جولانی بخشتا ہے۔

پاکستان نُور ہے، نُور کو زوال نہیں

شرکائے مذاکرہ

- جسٹس انوار الحق
- پروفیسر اشفاق علی خان
- اشفاق احمد
- منیر نیازی
- خاطر غزنوی
- ڈاکٹر سلیم اختر
- عبدالمجید
- اختر امان
- اظہر جاوید
- خواجہ افتخار
- امجد طفیل
- واصف علی واصف صاحب

میزبان: عطاء الحق قاسمی

عطاء الحق قاسمی:

خواتین و حضرات! میں مجلسِ اقبال ایم اے او کالج لاہور اور ایوانِ

وقت کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں نے جنابِ واصف علی واصف صاحب کو یہاں بلایا ہے۔ واصف صاحب ہمارے ملک کے ممتاز دانشوروں میں سے ہیں۔ ہماری دیرینہ خواہش تھی کہ ان سے گفتگو کی جائے' گفتگو کا حوالہ پاکستان ہے۔ چنانچہ واصف صاحب سے باتیں کریں گے اور یہ باتیں وہ نہیں ہوں گی جو اخباری حوالوں سے ہم تک پہنچتی ہیں بلکہ گفتگو کا طور روحانی سفر ہو گا۔ یعنی یہ کہاں سے شروع ہوا اور آج کس صورت میں نظر آرہا ہے۔ خوش قسمتی سے اس وقت اشفاق صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں' آپ واصف علی واصف صاحب سے مکالمہ کریں گے اور بعد ازاں جو سوالات ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوں گے وہ واصف صاحب سے پوچھیں گے۔ میں جناب اشفاق احمد سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی گفتگو کا آغاز فرمائیں۔

اشفاق احمد:

واصف صاحب! یہ کوئی روائتی مجلس نہیں بلکہ مجالس کی عام ڈگر سے ہٹ کر ہے اس محفل میں' میں اور میرے ساتھی یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہماری ذات سے لے کر یہ سفر جو بہت پیچھے سے ہمارے بزرگوں کا سفر ہے' یہ سفر اسی اعتبار سے ہوا اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ لیکن یہ سفر بیرونی طور پر ہی نہیں ہوا کرتا بلکہ ان کے اندر ہی ایک سفر ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاست اور معیشت کے پاکستان کے وجود میں آنے کا' پاکستان کے بننے کا اور پاکستانیوں کا جو روحانی سفر تھا۔ وہ سفر کیا بتدریج رواں ہے یا رک گیا ہے اور لوگ ستانے لگے ہیں۔ ہمارے درمیان جو اس وقت

عوام موجود ہے جس میں ہم سب لوگ شامل ہیں' جو بڑے یقین کے ساتھ اور حتمی طور پر اس بات کو مانتے بھی ہیں اور اعلان بھی کرتے ہیں کہ پاکستان بنا اس لئے تھا' کہ ہم اپنی زندگی بہتر کرنا چاہتے تھے' ہم اپنی زندگیوں کو آزادی عطا کرنا چاہتے تھے اور ہم نہایت دلجمعی کے ساتھ اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کے حوالوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جب ہم اس سے ہٹ کر پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔ مثلاً" ہم جو جالندھر' ہوشیار پور سے آئے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیاس کے مقام پر ایک چھکڑا جا رہا ہے' اس کو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہانک رہا ہے اس چھکڑے میں ایک اس کا باپ ہے' بیوی ہے' اس کی دو بچیاں ہیں' ایک بیٹا ہے' وہ جا رہا ہے۔ اچانک اس پر حملہ ہوتا ہے جس میں اس کا بیٹا مار دیا جاتا ہے۔ وہ اس جگہ پر ایک گڑھا کھود کر اپنے بیٹے کی لاش دفن کر دیتا ہے اور درود شریف پڑھتا ہوا چھکڑے کو لے کر پھر چل پڑتا ہے۔ حالانکہ اصولی طور پر تو اسے اپنا سفر روک لینا چاہئے تھا۔ پھر تھوڑا آگے جا کر اس کی بیٹی اٹھالی جاتی ہے۔ وہ پھر بھی درود شریف پڑھتا ہے۔ اللہ رسولؐ کو یاد کرتا ہوا آگے چل پڑتا ہے۔ یعنی کیا اس کو اس بات کی خواہش اور طلب تھی کہ آگے چل کر مالی طور پر مجھے ایک سنہرا مستقبل نصیب ہوگا یا یہ کہ اتنے خوفناک سفر سے گزرنے کے بعد اصولاً" اس کو یہ مان لینا چاہئے تھا کہ اب میں منہ سے وہ الفاظ نہ کہوں جو میں کہتا ہوں یا مجھے رک جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ بدستور اپنا چھکڑا ہانکتا ہوا سرحد تک پہنچ جاتا ہے۔ اب جب ہم بہت سمجھدار اور سوچنے والے ہو گئے ہیں' اب ہم کو اپنے آپ میں وہ خصوصیت نظر نہیں آتی۔ چنانچہ میں بالخصوص اور میرے ساتھی

بالعموم یہ جاننا چاہیں گے کہ موجودہ صورت حال میں جب کہ ہم سیاسی طور پر تو سمجھ گئے ہیں کہ یہ ووٹ ہوتا ہے' یہ بیلٹ بکس ہے' یہ جمہوریّت ہے اور ایسے اسمبلی بنتی ہے۔ یہ سب کچھ تو ہم جان گئے ہیں اور اس کی تو اب ضرورت نہیں جاننے کی۔ بات یہ ہے کہ کیا ہمارے بچ نکلنے کے لیے کوئی ایسا سوچ ہے جس سے ہم میں پھر وہی ایمان اور یقین کی کیفیت پیدا ہوگی۔ اور ہم پھر پہلے کی طرح اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے۔ مایوسی کی فضا دور ہوگی اور غیر یقینی حالات بہتر ہوں گے۔ کیونکہ کچھ لوگ تو پاکستان کے قائم رہنے کے بارے میں بھی شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں۔ سوال لمبا ہوگیا ہے مگر اب یہ معلوم نہیں کہ میں اپنا مقصد سمجھا سکا ہوں کہ نہیں؟

واصف علی واصف صاحب :

حاضرینِ محفل کی خدمت میں سلام پہنچے۔ سوال بڑا واضح ہے اور اس کا جواب بھی بڑا واضح ہے۔ غیر یقینی حالات پر تقریریں کرنے والے کتنے یقین سے اپنے مکان بنا رہے ہیں۔ دراصل جس انسان کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں وہ کسی مستقبل پر کبھی اعتماد نہیں کرسکتا۔ مستقبل حال سے ہے' اپنے حال پر راضی رہنا چاہیئے۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم اپنے مستقبل سے مایوس نہ ہوں۔ اگر کشتی میں ایک انسان بھی خوش نصیب ہو تو اس کے کنارے لگنے کا شک نہ ہونا چاہیئے۔ خوش نصیب وہ انسان ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہو۔ آج کا انسان ایک نامعلوم اندیشے سے دوچار ہے۔ اندیشہ ذاتی' ملکی اور بین الاقوامی حالات کی وجہ سے ہے۔ ذاتی اندیشہ اس لئے ہے کہ ہماری زندگی

کثیر المقاصد ہو کے رہ گئی ہے۔ خواہشات کی کثرت نے زندگی میں بے مقصدیت پیدا کردی ہے۔ ہم کئی زندگیاں گزار رہے ہیں اور اس طرح ہمیں کئی اموات سے دوچار ہونے کا ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ ملکی سطح پر ہم سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے اندیشے میں مبتلا ہیں۔ وحدتِ افکار نہ ہونے کی وجہ سے وحدتِ کردار نہیں۔ اسی لئے ملت میں وحدت کا شعور نہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ کیسے مسلمان ہیں جن پر اسلام نافذ نہیں ہو سکا! اور یہ کیسا اسلام ہے جو مسلمانوں پر نافذ نہیں ہو سکا۔ اندیشوں سے بچنے کا طریقہ بھی آسان ہے۔ اندیشے کی ضد امید ہے۔ امید اس خوشی کا نام ہے جس کے سہارے غم کے ایّام بھی کٹ جاتے ہیں۔ فطرت کے مہربان ہونے پر یقین کا نام امید ہے۔ غور کرنا چاہئے کہ موت سے زیادہ خوف ناک موت کا ڈر ہے اور موت کا ڈر بے معنی ہے کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ خطرات کے باوجود زندگی وقت سے پہلے ختم نہیں ہو سکتی اور احتیاط کے باوجود زندگی وقت کے بعد قائم نہیں رہ سکتی۔ میں یہ گزارش کر رہا ہوں کہ بہتر وقت آنے والا ہے۔ جس طرح موسم بدلنے کا ایک وقت ہوتا ہے اسی طرح وقت بدلنے کا بھی ایک موسم ہوتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ زندگی' موت کی حفاظت و پناہ میں ہے۔ ہم اجتماعی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لیکن ہم فردا" فردا" جواب دہ ہیں۔ لالچ نکل جائے تو خوف نکل جاتا ہے۔ جو اپنے فرائض کی ادائیگی کرتا ہے وہ خوف سے آزاد ہے۔ خوف کوتاہیوں کا نام ہے۔ ہم اپنے اعمال کی عبرت کے خوف میں مبتلا ہیں۔ گناہوں نے دعائیں چھین لی ہیں۔ ہم آج بھی ایک عظیم قوم بن سکتے ہیں اگر ہم معاف کرنا اور معافی مانگنا شروع کر

دیں۔ اگر ہمارا فرض اور شوق یکجا ہو جائے تو زندگی خوف سے آزاد ہو سکتی ہے۔

اصل میں مادی اشیاء کی محبت نے ہم سے ذوقِ سفر چھین لیا ہے۔ ذوقِ سفر نہ ہو تو رہنماؤں کا شکوہ کیا؟ ہم بے سکون ہو چکے ہیں کیونکہ ہم دوسروں کا سکون برباد کر کے سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دل سے کدورت نہ نکلے تو سکون کیسے حاصل ہو۔ زندگی میں غم اور خوشی تو آتے ہی رہتے ہیں۔ بیدار کردینے والا غم غافل کردینے والی خوشی سے بدرجہا بہتر ہے۔ حقیقت ثابت نہیں کی جاسکتی۔ سورج کی روشنی کا ثبوت دیکھنے والے کی آنکھ مہیّا کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے یہ ملک قائم رہے گا۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ محروم و مظلوم کی داد رسی ہو گی۔ حق والا حق پائے گا۔ ہم سب ایک وحدت ہیں۔ اصل میں جس کو اپنی فلاح کا یقین ہو وہ تبلیغ کر سکتا ہے تاکہ دوسرے اس نعمت میں شریک ہوں۔ مبلغ کی صداقت کا ثبوت یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کو صرف اپنے علم میں شریک نہ کرے بلکہ اپنی آسائشوں میں بھی شریک کرے۔ ہم طاقت اور دولت سے خوشی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عقیدے میں ہم فرعون کو ملعون کہہ چکے ہیں۔ طاقت خوف پیدا کرتی ہے' خوف نفرت پیدا کرتا ہے' نفرت بغاوت پیدا کرتی ہے اور باغی ذہن ملک کے ٹوٹنے کی بد دعا کرتے ہیں۔ طاقت محبت میں بدل جائے تو ملک سلامت ہی سلامت ہے۔ نیکی لاٹھی نہیں جس سے بدی کو ہانکا جائے' نیکی میزبان ہے جو بدی کی ضیافت کر کے اسے راہِ راست پر لاتی ہے۔ نیکی کا مزاج مشفق والدین کا سا ہے اور بدی باغی اور سرکش اولاد کی طرح ہے۔ بدی محبت سے ٹھیک ہو سکتی

ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم غور کریں' دعا کریں اپنے اعمال کی' اپنے افکار کی' اپنے الفاظ کی اصلاح کریں۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ لوگ یہ کہیں کہ ہمیں اس کا پہلے ہی اندیشہ تھا۔ خدا ہمیں ہمارے اندیشوں سے بچائے۔ اگر اللہ رحمت کے جوش میں مخلوق کو بخش دے اور گناہوں کو معاف کر دے تو کیا ہوگا موت کا منظر مرنے کے بعد؟ کیا اللہ معاف کرنے پر قادر نہیں؟ آج ہر انسان گلہ کر رہا ہے' کچھ لوگ مخلوق کا گلہ کر رہے ہیں' خالق کا گلہ کر رہے ہیں' مخلوق کے سامنے اللہ کا شکر ادا کرنے والے کہاں گئے؟ یقین دلانے والے کیا ہوئے؟ کیا ہمیشہ کے لئے بند ہو جانے سے پہلے ہماری آنکھ نہیں کھل سکتی؟ کیا ہم دوبارہ یقین کی منزل کو حاصل نہیں کرسکتے' یقیناً کرسکتے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حالات بہتر ہوں گے جلد ہی۔ کیا اقبالؒ کے خواب کے بعد کسی مردِ مومن کو کوئی تازہ ملت ساز خواب نہیں دکھائی دے سکتا؟ کیا خیالات بدل نہیں سکتے؟ کیا حالات بدل نہیں سکتے؟ کیا زندگی منفعت سے نکل نہیں سکتی؟ کیا ہم پر اس کی رحمت کے دروازے نہیں کھل سکتے؟ کیا ہم رحمتہ اللعالمینؐ سے مایوس ہوگئے ہیں؟ خدا ہمیں وہ نظر پھر سے عطا کرے گا۔ وہ دل پھر سے ملے گا۔ مسلمانوں کو آسانیاں دو' انہیں زیادہ علم کی ضرورت نہیں' یقین کی ضرورت ہے۔ معاف کرنے والے کے سامنے گناہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ عطا کے سامنے خطا کا کیا ذکر۔ زندگی سے تقاضا اور گلہ نکال دیا جائے تو یقیناً سکون مل جاتا ہے۔ جھوٹا آدمی کلام الٰہی بھی بیان کرے تو اثر نہ ہوگا۔ صداقت کے بیان کے لئے صادق کی زبان چاہئے' بلکہ صادق کی بات کو ہی صداقت کہتے ہیں۔

کامیابی اہم نہیں مقصد اہم ہے۔ برے مقصد میں کامیابی سے اچھے مقاصد میں ناکامی بہتر ہے۔ اللہ کی رحمت اس کے غضب سے وسیع ہے۔ زندگی اور عقیدے کا فرق ختم ہونا چاہئے۔ جس خطرے کا وقت سے پہلے احساس ہو جائے تو وہ ضرور ٹل سکتا ہے۔ دعا اسی لئے ہوتی ہے کہ آنے والی بلاؤں کو ٹالا جائے۔ نیک انسان کی دعا بھی سب کی نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ خطرہ باہر نہیں ہوتا خطرہ اندر ہوتا ہے۔ سانس اندر سے اکھڑتی ہے۔ آج کے مسلمان کو موت کے خطرے سے زیادہ غریبی کا خطرہ ہے۔ پہلے غریب کی معاشی حالت کی اصلاح کی جائے پھر اس کے ایمان کی۔ بیمار سے کلمہ نہ سنا جائے اس کے لئے دوا کا انتظام کیا جائے۔

آج انسانوں کے وسیع سمندر میں ہر انسان ایک جزیرے کی طرح تنہا ہے۔ تنہائی کا خوف سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ تنہائی روح تک آ پہنچی ہے' اللہ کا سہارا ہی بچا سکتا ہے۔ جو لوگ سیاسی اور سماجی ضرورت کے لئے اللہ کا نام لیتے ہیں' ان کے لئے مایوسی اور کربِ مسلسل کا عذاب ہے۔

ایک معمولی سا واقعہ ہی غیر معمولی نتائج برآمد کر جائے گا۔ بعض اوقات دور سے آنے والی آواز اندھیرے میں روشنی کا کام دیتی ہے۔ ایک چہرہ زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ پاس سے گزرنے والا خاموش انسان کئی تبدیلیاں پیدا کر جاتا ہے۔ ایک نگاہ زندگی کا حاصل بن کے رہ جاتی ہے۔ مکڑی کا کمزور جالا ایک قوی دلیل کا کام دے جاتا ہے۔ انسان کے مزاج کو بدلنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ ایک خوش مذاق انسان تمام محفل کو اداسی سے نکال سکتا ہے۔ ایک سوچ پورے فکر کے انداز کو

بدل کے رکھ دیتی ہے۔

پاکستان کے ٹوٹنے کا اندیشہ اس لئے بھی نہیں ہے کہ یہ صرف نو کروڑ پاکستانیوں ہی کا مستقبل نہیں بلکہ یہ مسلمانانِ عالم کا مستقبل ہے۔ اس کی بنیادوں میں شہداء کا خون ہے۔ اب اسلام کی عظمت کا نشان ہے۔ اسلام کی حفاظت اسلام خود فرمائے گا۔ اللہ حفاظت کرے گا۔ اللہ کے حبیبؐ اس کے محافظ ہیں۔ ہمارے اندیشے محض ذاتی ہیں یا سیاسی ہیں' ان میں نہ کوئی جواز ہے نہ بنیاد۔ موجودہ حکومت سے کسی قسم کے اختلاف کا نتیجہ یہ تو نہیں کہ ملک ہی نہ رہے۔ اگر ہم شہداء کے نصیب پر یقین رکھتے ہیں صوفیاء' علماء' فقراء کے نصیب پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر ہم اقبالؒ کے نصیب پر یقین رکھتے ہیں' اگر ہم اللہ' اللہ کے حبیبؐ پر' اسلام پر یقین رکھتے ہیں تو ہمیں پاکستان کی سلامتی کا بھی یقین ہونا چاہئے۔ ایک انسان صرف ایک انسان جو قائد اعظمؒ کی طرح سب میں مقبول ہو' قوم کے نصیب کو بدل سکتا ہے اور کسی ایک رہنما کے آنے کا عمل اتنا ناممکن نہیں بلکہ ایسا ہوگا۔ ایسا ہونے والا ہے۔ ملک محفوظ رہے گا۔ ہم اپنے اعمال کی اصلاح کریں۔ اپنے عقیدے پر یقین رکھیں۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ ملک کو کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ ملک کو خطرے سے دوچار کرنے والے خود خطرات میں گھرے ہوتے ہیں۔ تعجب ہے دس کروڑ غلام مسلمانوں نے ایک عظیم ملک تخلیق کر لیا۔ آج دس کروڑ آزاد مسلمان اس ملک کی بقا کے بارے میں خدشات کا ذکر کرتے ہیں۔ ہمارے ایمان میں اور ہمارے کردار میں دراڑیں ہیں۔ ملک میں کوئی دراڑ نہیں۔ پاکستان میں ایک عظیم روحانی دور آنے والا ہے۔ سب

ٹھیک ہو جائے گا۔ اندیشہ نہیں کرنا چاہئے۔ اندیشہ عروج کا دشمن ہے۔

اختر امان :

واصف صاحب! پاکستان ہم نے مسلمانوں کی روحانی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی نگہداشت کے لئے قائم کیا۔ یہاں سے جتنے مسلمان لندن، کینیڈا اور مشرق وسطیٰ میں جاکر رہ رہے ہیں ان کا کلچر، ان کا مذہب، ان کی معیشت یہاں سے زیادہ محفوظ ہے۔ تو کیا نئے دور کے جو تقاضے ہیں ان میں جو اٹھنے والے سوالات ہیں ان کا بھی کوئی جواب ہے آپ کے پاس؟

واصف علی واصف صاحب :

اس سوال کا جواب تو ہم پہلے بھی دے آئے ہیں۔ یہی سوال ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا تھا۔ اگر دین کے لئے ملک بنا تو دین تو ہر جگہ ہے۔ جہاں مصلّٰی بچھایا، دین شروع ہو گیا۔ مسجدوں کو غیر آباد کر کے جانے والو! تم کون سا اسلام لے چلے ہو۔ جو لوگ پاکستان کے نظریے سے اختلاف رکھتے تھے کہ سیاست، معیشت، کلچر وغیرہ محفوظ کرنے کے لئے ملک بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم نے سب کو جواب دیا، عملی جواب کہ ثقافت اور کلچر محفوظ کرنے کے لئے ملک کا ہونا ضروری ہے۔ اسلامی ریاست کا قیام ہی منشائے اسلام ہے۔ پاکستان سے باہر رہنے والے مسلمان آباد ہیں۔ پاکستان کے دم سے ہی سب آبادیاں ہیں۔ نئے تقاضے ہمارے پرانے دین کو کبھی بدل سکے ہیں نہ بدل سکیں گے۔ سب نئے سوالات کا جواب ایک مضبوط پاکستان ہے۔ سب کا پاکستان

برابر کا پاکستان۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

مشرقی پاکستان علیحدہ ہونے سے پہلے بھی یہی کہا جاتا تھا کہ ایسی صورت حال پیدا نہیں ہو گی۔ لیکن ایسا ہو گیا اور اب پھر وہی کہا جارہا ہے کہ باتیں لغو ہیں' ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ضمانت کوئی نہیں ہے۔

جسٹس (ریٹائرڈ) انوار الحق:

واصف صاحب سے پہلے اس سلسلے میں کچھ کہوں گا۔ ابھی جو واصف صاحب نے فرمایا ہے تو اس سے یہ تاثر پیدا نہیں ہوتا کہ اگر پاکستان ٹوٹے گا تو پھر ہم کیا کریں گے۔ اب تو ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ اگر واقعی ایسا خدشہ ہے تو اس پر غور کریں کہ اس خدشے کو کیسے دور کیا جائے۔ اگر ایسا ہو گا تو پھر کیا ہو گا؟ اس لئے اس قسم کا سوال ابہام پیدا کرتا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے' اگر ایسا ہوا تو ہم کیا کریں گے "بھئ پھر ہم مر جائیں گے اور کیا کریں گے"۔

اختر امان:

یہ سوال آج سے چالیس سال پہلے بھی ایک قوم کے ذہن میں تھا۔ ہندو سوچا کرتے تھے کہ اگر بھارت ٹوٹ گیا تو پھر کیا ہو گا اور بھارت ٹوٹ گیا۔ پاکستان بنا' پھر پاکستان ٹوٹا' بنگلہ دیش بنا۔ تو جس طرح برصغیر کا ٹوٹنا ہندو کی نفسیات کا حصہ بن گیا اسی طرح پاکستان کا ٹوٹنا ہماری نفسیات کا حصہ بن گیا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

واصف علی واصف صاحب :

آپ کا اندیشہ خلوص پر مبنی ہے لیکن حقیقت پر مبنی نہیں۔ اندیشہ پیدا کرنے والے عوامل کا قبل از وقت خیال کیا جائے تو انسان اندیشے سے نکل سکتا ہے۔ کوئی جواب انسان کو اس وقت تک مطمئن نہیں کر سکتا جب تک جواب دینے والے پر یقین نہ ہو۔ چونکہ ہم مستقبل کے بارے میں بات کر رہے ہیں اس لئے بہتر ہوگا کہ آنے والی کسی ناگہانی آفت کو دعا سے دور کر لیا جائے۔ پہلے پاکستان ٹوٹا؟ لیکن اس سے پہلے پاکستان بنا بھی۔ تو ہم توڑنے والوں کی بجائے بنانے والی قوت پر کیوں نہیں یقین رکھتے۔ ایک معمولی سی چڑیا اپنے گھونسلے کی حفاظت میں شاہینوں سے لڑ جاتی ہے۔ شیر دھاڑتے رہتے ہیں اور ہرن کے بچے پھرتے رہتے ہیں۔ آپ پاکستان کے ٹوٹنے اور بنگلہ دیش کے بننے کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ اس واقعہ یا سانحہ کا ہندوستان کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیں تو آج ہندوستان کے لئے پاکستان کا ٹوٹنا ایک زیادہ خطرے کا باعث بن چکا ہے۔ آج ہندوستان چار پاکستانوں سے دوچار ہے۔ ہمارا پاکستان' بنگلہ دیش' ہندوستان کے اپنے ۹ کروڑ مسلمان اور خطرے کے لحاظ سے خالصتان کی تحریک۔ اللہ ہمیں ہمارے دشمنوں سے بچائے اور ہمارا سب سے بڑا دشمن اندیشہ ہے جو ہمارے ایمان کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا کہ خطرات زندگی کی میعاد کو کم نہیں کر سکتے اور احتیاط اسے ایک لمحہ زیادہ نہیں کر سکتی۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اللہ پر بھروسہ رکھیں تو ایمان' زندگی اور پاکستان سلامت رہیں گے۔ اگر انتظار ہی کرنا ہے تو کیوں نہ اچھے وقت کا انتظار کیا جائے۔

اشفاق علی خان :

ان کا سوال میں دہراتا ہوں۔ اور یہ بات بڑے عاجزانہ طریقے سے پیش کی جاسکتی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میری کتاب فروری ۱۹۴۱ء میں چھپ گئی تھی اس پر ۲۷ نقشے تھے۔ جب میں نے ۱۹۳۷ء میں ایم اے پاس کیا تو مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ پاکستان ضرور بنے گا۔ اب میں کسی کو کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے یہ یقین ہے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ میں نے وہ کتاب لکھنی شروع کردی' جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی۔ واصف صاحب حال میں کچھ اندیشے ہیں۔ حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں تک نظر دوڑاتا ہوں اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لئے کہیں کوئی مناسب جگہ نہیں ملتی۔ میں واصف صاحب سے چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کچھ بتائیں تاکہ میرا یقین مضبوط ہو اور جو لاجیکل پروسیس ہے وہ میرے دل کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

واصف علی واصف صاحب :

آپ بہتر علم رکھتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عقیدہ حالات کے فوری تجربے یا فوری تجزیے یا فوری نتیجے پر زور نہیں دیتا۔ عقیدہ حالات کے لئے ایک عاقبت رکھتا ہے۔ فلسفہ یا لاجک سے یقین کی پرورش نہیں ہوسکتی۔ لاجک فرد کی گتھیاں سلجھاتی ہے لیکن جنون یقین کی منزل دکھاتا ہے۔ یقین کسی کی ذات پر اعتماد کا نام ہے۔ قائد اعظمؒ انگریزی میں تقریر کرتے تھے تو دیہات کا ایک گنوار مسلمان اپنے اندر تقویت محسوس کرتا تھا۔ اللہ کی رحمت پر بھروسہ ہو تو یقین میسر آتا ہے۔ اللہ لاجک سے سمجھ

نہیں آتا ہے۔ یہ یقین ایک نگاہ سے بھی حاصل ہو سکتا ہے اور زندگی' کاوشوں سے بھی نہیں ملتی۔ یقین غور سے حاصل نہیں ہوتا یقین، ایمان کا نام ہے۔ اجتماعی عمل ختم ہو جائے تو قوم پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں یہ گزارش کروں گا کہ یقین یا سکون کے لئے رجوع الی اللہ کیا جائے۔ پاکستان کے مستقبل پر یقین کیا جائے' اپنی ذات پر اعتماد کیا جائے' دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو تحمل سے سنا جائے۔ ہر انسان پاکستان سے مخلص ہے۔ کسی کے خلوص پر شک نہ کیا جائے۔ اسلام مسلمانوں کے طرزِ حیات کا نام ہے۔

خواجہ افتخار :

مشرقی پاکستان کا جو زخم لگا اس کی کسک تو آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بدنصیبی سے آج بھی ہمارے ملک کے مختلف صوبوں میں جو آگ لگی ہوئی ہے آپ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں اس کے متعلق بتائیں کہ حل کیا ہے۔ جیسا جسٹس انوارالحق صاحب نے فرمایا کہ سوال یہ نہیں ہے کہ پاکستان خاکم بدہن نہیں رہے گا۔ سوال یہ ہے جس کے دو پہلو ہیں کہ ہندوستان کی حکومت کو ہم سے زیادہ مسائل ہیں' وہاں کی معاشی حالت ہم سے زیادہ خراب ہے۔ وہاں کے فٹ پاتھ پر ہزاروں لوگ رات بسر کرتے ہیں۔ انسان حیوانوں کی طرح رکشا کھینچتے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کے فضل سے معاشی خوشحالی بھی ہے اور اقتصادی بھی' تو کیا وجہ ہے یہاں منفی باتیں کی جاتی ہیں۔ جب کہ بھارت میں کوئی ایسا نہیں کہتا کہ ہندوستان ٹوٹ رہا ہے یا ٹوٹ جائے گا۔ ہم ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے اور اس کا عمل کیا ہے؟

واصف علی واصف صاحب :

کیا ہندوستان میں کوئی نہیں کہتا کہ ہندوستان ٹوٹ رہا ہے۔ اس بات پر غور کر لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ وہاں کے لوگ بھی اعتماد سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ وہاں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ ہم تو اندیشوں کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل ہماری عافیت کے ذمہ دار شعبوں پر ہمارا اعتماد ختم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر کی ذات پر اعتماد نہ ہو تو اس کی ذہانت بھی بے کار ہے اور دوائی بھی کار آمد نہ ہوگی۔ بیماری کا اصل علاج اعتماد ہے معالج پر اعتماد' اپنے مستقبل پر اعتماد۔ یہ اعتماد تعلّق سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ کہنے والے نے کہا کہ اللہ ہے اور ہم نے مان لیا کہ اللہ ہے۔ ہم نے صادقؐ کی زبان پر اعتماد کیا ہے اس لئے اللہ پر یقین تقرّب کا ایک درجہ ہے۔

اظہر جاوید :

یہ جو فقیر کشف و کمالات دکھاتے ہیں یہ فقیری کے لئے کوئی ضروری چیز نہیں لیکن کسی وقت اس کی ضرورت بھی آ پڑتی ہے۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ جو خوشنما منظر آپ کی آنکھوں نے دیکھا ہے وہ منظر ہماری آنکھیں بھی دیکھنا چاہتی ہیں۔ بس ہمیں وہ منظر دیکھنا ہے۔

واصف علی واصف صاحب :

اس کا اشارہ تو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔ یقین و اعتماد پر بہت کچھ بڑے بڑے انسانوں نے بھی لکھا ہے ؎

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

یقین حاصل کرنے کا کوئی فارمولا نہیں دیا جا سکتا ؎

علاجِ ضعفِ یقین ان سے ہو نہیں سکتا
غریب گرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

یقین تحقیق سے نہیں، تسلیم سے ملتا ہے۔ اس کے لئے کوئی اور نسخہ تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ وسوسوں، اندیشوں اور شکوک و شبہات کے زمانے میں دولت یقین کا میسر آنا ہی بڑی کرامت ہے۔ آپ ایک آنے والے اچھے دور پر اگر یقین کر لیں تو آپ کا کیا بگڑتا ہے۔

خاطر غزنوی :

ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے گفتگو شروع کی تو باطنی حوالے سے کی۔ اس دوران باہر سڑک کا شور کمرے میں آیا تو آپ نے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ گویا آپ بھی جانتے ہیں کہ خارج کا اثر باطن پر ہوتا ہے۔

واصف علی واصف صاحب :

جہاں آپ نے یہ بات نوٹ کی، ایک قدم اور آگے بڑھتے تو یہ بھی نوٹ کر لیتے کہ خارجی اثر مقرر پر نہیں ہوتا تو سامعین پر تو ضرور ہوتا ہے۔ آپ توجہ فرماتے تو دروازہ بند کئے بغیر بھی یہ مسئلہ حل ہو جاتا۔

منیر نیازی :

واصف صاحب کے سامنے میرے تو ذہن میں کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو رہا ہے یہ عجیب بات ہے۔ حس کے چھٹے مقام پر بات چیت ہو

رہی ہے اس کو میں محسوس کر رہا ہوں۔ یہ جو جرنلسٹ اور اڈیٹوریل قسم کے کلیے ہیں میرے اندر سے نکل ہی نہیں پا رہے۔ بے شمار سوالات ہیں ساری دنیا ہی سوالوں میں پھنسی ہوئی ہے لیکن جو انہوں نے اصل بات کی ہے کہ اندر ایک اطمینان موجود ہے وہی اصل چیز ہے۔ وسوسے تو انسان بہت پیدا کرتا ہے لیکن ان کو دور بھی ایک ہی انسان کرتا ہے۔ پوری ملّت کو وسوسوں سے نکالنے والا بھی ایک ہی آدمی ہوتا ہے۔

جسٹس (ریٹائرڈ) انوارالحق :

اشفاق صاحب آپ بات کو آگے بڑھائیں۔ واصف صاحب نے تو اپنا نقطہ بالکل واضح کر دیا ہے۔ آپ ان کے مقابل بیٹھے ہوئے ہیں اس لئے بات آگے بڑھائیں۔

اشفاق احمد :

میرا تعلّق روحانیت سے تو نہیں ہے اور دلچسپی بھی صرف کتابی طور پر ہے۔ میرا سوال یہ تھا اور اس گفتگو کے بعد بنتا بھی ہے کہ ہمارے دل میں وہ یقین کیوں نہیں ہے جو آپ کے دل میں ہے۔ مثال کے طور پر ہم لوگ بغیر کسی دلیل کے ایک شخص کو اپنا باپ مانتے ہیں' یہ یقین کی بات ہے حالانکہ اس کے بارے میں کوئی دلیل نہیں دی جا سکتی لیکن اس سے کمزور یقین کا معاملہ ہے وہاں کچھ نہیں ہو پاتا۔

جسٹس (ریٹائرڈ) انوارالحق :

جناب Presumption ہے Conviction نہیں ......

امجد طفیل :

واصف صاحب آپ نے شروع میں فرمایا تھا کہ پاکستان کی تعمیر کا جو عمل تھا یہ ہمارا روحانی سفر تھا تو اگر یہ روحانی سفر تھا تو اس کی کیا وجہ تھی کہ جو لوگ روحانی سفر طے کر کے یہاں آئے انہوں نے زمین اور مکانات الاٹ کرانے شروع کر دئے اور جلد ہی یہ روحانی سفر ختم ہو گیا۔ اس کی کیا وجہ تھی کہ ہم اس روحانی سفر کو چند سال بھی جاری نہ رکھ سکے۔

واصف علی واصف صاحب :

کالج کے ذہین طالب علم کا سوال ہے اور بڑا ذہین سوال ہے۔ جواب یہ ہے کہ اگر ہم نے کہا کہ یہ روحانی سفر تھا تو ہم نے یہ کب کہا کہ یہ سفر ختم ہو گیا۔ آپ روحانی سفر کو روحانی انداز سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اندازِ نگاہ ہے۔ یہی زندگی ظاہری ہے' یہی باطنی' یہی دینی اور یہی لا دینی ہے۔ روحانی زندگی بھی مادی تقاضوں سے مبرّا نہیں۔ یہاں تک کہ پیغمبران علیہم السلام ضروریات اور حاجات کی زندگی گزارتے رہے اور دنیا کو عظیم روحانی اور دینی راستوں سے آشنا کراتے رہے۔ نبی پر ابتلاء کا زمانہ بھی آ جائے تو نبوّت کے منصب میں فرق نہیں آتا۔ سفر جاری ہے یقین موجود ہے۔ آج ہم اندیشوں کی بات کر رہے ہیں یہ صرف احتیاط کی بات ہے۔ یہ مذاکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم الحمد للہ مایوس نہیں ہیں۔ آپ طالب علم ہو۔ ہم آپ کا ماضی ہیں۔ آپ ہمارے مستقبل ہو۔ امید کا چراغ بجھنے نہ دینا۔ یہ ملک بڑی نعمت ہے۔ خدا اسے سلامت رکھے گا۔

عبدالمجید خان :

واصف صاحب مجھے ذاتی طور پر آپ کے روحانی تجربات کی صداقت پر یقین ہے۔ لیکن حضرت میں درخواست کروں گا کہ آپ اس قلبی واردات کو دوسرے تک پہنچانے اور سمجھانے کے لئے ہماری رہنمائی فرمائیں۔

واصف علی واصف صاحب :

کسی قلبی واردات کو دوسرے تک پہنچانے کے لئے واردات ہی ہونی چاہئے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ واردات ایک مشاہدہ ہے اور مشاہدہ کا بیان سامع کو صاحبِ مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ مشاہدہ سامعین کی تسلیم کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔ لیکن آپ بتائیں کہ یہ یقین کیسے میسّر آیا' دراصل یقین عطا ہوتا ہے۔ آیئے ہم دعا کریں کہ خدا اس قوم کو پھر سے سرمایۂ یقین عطا فرمائے۔ بات مختصر اور آسان ہے کہ جب تک حضور نبی کریم ﷺ سے محبت نہ ہو' عشق نہ ہو' یہ یقین مل سکتا ہی نہیں۔ حضورؐ ہی کے کرم سے بات بنتی ہے۔ حضورؐ ہی کی محبت سے بات بنے گی اور ضرور بنے گی۔ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ یہ اسلام ہے' اس اسلام کی حفاظت کریں' پاکستان مضبوط ہو گا۔ غریب کے ایمان کی اصلاح کی ضرورت نہیں' اس کی غربت دور کرنے کی ضرورت ہے۔ بیمار آدمی کو کلمہ سنانے کے لئے نہ کہیں' اس کے لئے دوا کا انتظام کریں' اسلام اور پاکستان کو کبھی خطرہ نہیں ہو گا۔

روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین کے لئے محترمہ شاہدہ تبسّم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ایک سروے کیا۔ اس میں انہوں نے مابعدالطبیعاتی موضوعات پر مختلف صاحب الرائے شخصیّات سے انٹرویو کیے۔ یہ انٹرویو پڑھ کے مختلف عملیات، جن بھوت، توہم پرستی اور نُوری علوم کے بارے میں ایک وسیع النّظر تاثر بنتا ہے۔ اس سلسلے میں ماہر دست شناس ایم۔ اے۔ ملک، مشہور ستارہ شناس اور معالج ہومیو ڈاکٹر اختر امرتسری اور جناب واصف علی واصف صاحبؒ سے سیر حاصل مکالمہ پیشِ خدمت ہے جس کو پڑھ کر علم و آگہی کی نئی جہتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔

عالمِ اسرار .... ایک جائزہ

تا حدِ نگاہ پھیلے نیلگوں آسمان، شوخ رنگ پھلواریوں سے مزیّن، رنگا رنگ متنوّع مناظر سے پُر، سرکتے بدلتے، خوشبو دار بھیگے موسموں کی آماجگاہ زمین جہاں سانس لیتی، جیتی جاگتی مجسّم زندگی کے اندر ایک اور بھی دنیا بستی ہے۔ پُر اسرار دنیا، غیر مرئی دنیا، موجودات سے عاری، وجودیّت سے بالا تر، زمان و مکان کی حدود سے آزاد، مادیّت سے مبّرا، مجسّم شکل سے بے نیاز، محسوسات کی گرفت سے آزاد دنیا، ہماری دنیا کے اندر موجود ہے۔ بس یہیں کہیں آگے پیچھے ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس پُر اسرار دنیا نے ابتداء میں یونان اور برّ ِصغیر پاک و ہند میں اپنی آنکھ کھولی، پروان چڑھی اور پھر تمام دنیا کا سفر کر کے اپنے "ہونے" کا جگہ جگہ اظہار کیا۔ عقلی، منطقی اور سائنسی توجیہات کے متلاشی لوگوں نے اسے رد کر دیا اور مذہب پرست حلقے، مذہبی حوالوں کی بنیاد پر اس پر ایمان لے آئے کہ مذہب میں ماورائی قوّتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر مذہب کی تعریف میں ماورائی قوت سے انکار کیا جائے تو اسے مذہب نہیں "اِزم" پکارا جانا چاہئے جیسے کارل مارکس کا پیش کردہ نظریہ "کمیونزم" ماورائی قوّت و طاقت کے عنصر سے قطعی عاری ہے۔

پُر اسرار علوم کا تعلّق شخصی واردات سے ہے، ذاتی تجربہ اور مشاہدہ سے ہے، اس کا منطقی وجود نہیں ہے۔ اس کی اب تک کوئی سائنسی توجیہہ حاصل نہیں کی جا سکی لیکن تحقیق و جستجو سائنسی حوالوں

سے جاری ہے کہ سچے خواب کیا ہیں؟ روحانی پیغام رسانی کیونکر ممکن ہے۔ پرانے وقتوں میں کاہن مستقبل کی اطلاع یا خبر کیسے فراہم کر دیتے تھے۔ اسلامی تاریخ اور اولیائے کرامؒ پُراسرار علوم کے مظاہر کے "ہونے" کی شہادت دیتے ہیں۔ محیّر العقول واقعات کا اظہار اولیائے کرامؒ کے ہاتھوں ہوتا رہا۔ وہ اس عمل سے یعنی شخصی واردات کے عمل سے گزرے ہیں۔ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ، داتا گنج بخشؒ، کس کس کا نام لیا جائے، اس ضمن میں مظاہرِ قدرت کی فراوانی کے اس عالم میں انسان اپنی محدود عقل اور ناپختہ تجربہ کی بنا پر ان مظاہر (جادو، ٹونا، علم نجوم، علم جفر وغیرہ) کا بھی اعتراف کرتا ہے۔ کبھی اس کی تردید کرتا ہے۔ زار روس کے بعد وہاں کی سرزمین کمیونزم کی آماجگاہ بن گئی۔ روحانیت پرستی عنقا ہو گئی۔ لیکن اس صورت حال کے ساتھ ایک صدی بھی نہ گزر پائی تھی کہ روسی مراجعت کی راہ پر دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ پیرا سائیکالوجی کے میدان میں آج دنیا بھر میں سب سے زیادہ تجربات روس میں ہو رہے ہیں۔ ٹیلی پیتھی یعنی روحانی پیغام رسانی پر تحقیق ہو رہی ہے۔ روحانیّت اور پُر اسرار علوم سے کچھ عرصہ بے اعتنائی برتنے کے بعد اس کی طرف واپسی کیوں؟ یہاں ایک واقعہ کا بیان بے جا نہ ہو گا۔ ایک عالمِ دین اور ایک ملحد دونوں ایک دوسرے پر اپنے نظریات کی صداقت ثابت کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے تھے، دونوں زیرک، ذہین و فطین عالم فاضل تھے اس لئے ایک دوسرے کو متاثر کرنے میں ناکام رہتے۔ ایک روز طے پایا کہ آج قصہ تمام ہونا چاہئے "یا تم مجھے قائل کر لو یا میں تمہیں قائل کر لوں" والی بات پر عمل ہونا چاہئے۔ دونوں تمام دن بحث میں الجھے رہے۔ رات گئے ناکام و نامراد اپنے گھروں کو لوٹ گئے کسی نتیجہ پر پہنچے بنا۔ اگلے روز معلوم

ہُوا کہ ملحد نے اپنے مختلف طبقوں اور شعبہ جات سے وابستہ افراد کے ایک سروے کے دوران انکشاف کیاکہ ان علوم، ان مظاہر کو تسلیم نہ کرنے والوں کے انکار میں اقرار ہے اور ان علوم کا اقرار کرنے والوں کے اقرار میں انکار کی آمیزش ہے۔ ایسی کیفیت متوسط طبقہ میں زیادہ پائی گئی ہے، اعلیٰ اور نچلے طبقہ سے متعلّق لوگ ان مظاہر پر زیادہ یقین رکھتے ہیں اور ان علوم سے وابستہ افراد کی بھی ہمارے ہاں کمی نہیں۔ جگہ جگہ ایسے لوگ موجود ہیں جن میں اکثریّت جعل سازوں اور دھوکا بازوں کی ہے جو اپنے نام نہاد علم کی بنیاد پر لوگوں کو بے وقوف بنا کر پیسے بٹورتے ہیں اور فریب دہی کی گنجائش یوں نکلتی ہے کہ ان مظاہر کا کوئی وجود نظر نہیں آتا اس لئے ایسا ممکن ہے۔ بے شک ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس علم پر حاوی ہیں لیکن انہوں نے اس کو کاروبار نہیں بنا رکھا۔ قارئین! آج ہمارا فیچر ان علوم کے حوالے سے ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ پُراسرار علوم سے متعلّق ڈاکٹر محمد اختر، ماہرِ دست شناس، ماہرِ نفسیات (پیرا سائیکالوجی)، ایم اے ملک اور ماہرِ روحانیات واصف علی واصف صاحب کیا کہتے ہیں۔ (شاہدہ تبسّم)

ڈاکٹر اختر :-

علم نجوم کیا ہے؟:

ستاروں کے علم کا نام علمِ نجوم ہے۔ یہ سات ستاروں، بارہ بروج، اٹھائیس منازل قمری اور ستائیس گھروں پر مشتمل ہے۔ جو لوگ ان کے خواص اور تاثیر سے واقفیّت رکھتے ہیں وہ منجّم کہلاتے ہیں، یہ علم ماضی، حال، مستقبل بعید پر حاوی ہے۔ اس کا آغاز روحانیت سے ہوا۔ یونانیوں

کے ہاں بروج کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی روحانیت سے معلوم کیا کہ بارہ بروج ہیں۔

زائچہ کیا ہے؟:

جو برج مشرق میں طلوع ہوتا ہے حساب کی رُو سے (حساب لگا کر معلوم کیا جاتا ہے) وہ طالع کہلاتا ہے۔ اُسے مقرر کرنے کے بعد باقی خانہ جات میں بروج کو بالترتیب لکھ دیتے ہیں اور جو کچھ جنتری بتاتی ہے اس کی رو سے کواکب سیارے ان کی پوسٹنگ کر دیتے ہیں زائچہ میں۔

علمِ جفر کیا ہے؟:

حروف تہجی کا وہ علم ہے جس کی معرفت ہم کسی بھی سوال کا جواب کسی فقرے کی صورت میں حاصل کرتے ہیں۔

روحوں سے ہم کلام ہونے کا طریقہ کار:

اس کے لئے خاص قسم کے اعمال ہوتے ہیں درود و وظائف ہوتے ہیں' وہ پڑھتے ہیں' اس دوران ایک خاص نوع کی کیفیت وارد ہوتی ہے جس کے دوران روحوں سے ہم کلام ہو سکتے ہیں' یہ بے خودی اور وجد کی سی ایک کیفیت ہوتی جسے (Trance) کا نام دیا جاتا ہے۔ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ میرے قریب موجود انسان یہ نہیں جان سکتا کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں' میں باتیں کرتا چلا جاؤں گا۔

ان علوم کا باہمی تعلق نہیں ہے یہ بالکل جُدا جُدا علوم ہیں۔ ان علوم سے واقفیت کے لئے مذہب کی کوئی قید یا پابندی نہیں' ان علوم سے شوق رکھنے والا کوئی بھی انسان ان پر دسترس حاصل کر سکتا ہے۔

کیا یہ علوم سائنس سے متصادم ہیں؟ :

یہ علوم بذاتِ خود سائنس ہیں ستاروں کا علم ایک سائنس ہے اجرامِ فلکی اور کرّۂ ارض ان کی ساخت، ماہیّت، رفتار سے بحث کرنے والے علم کا نام علمِ ہیئت ہے۔

قسمت یا تقدیر کیا ہے؟ :

میرا قسمت پر ایمان ہے، یقین تو چھوٹے درجہ کی بات ہے۔ علم نجوم یہ پڑھنے کا نام ہے کہ انسان کی تقدیر میں کیا ہے، اور کیا نہیں۔ قسمت یا تقدیر کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ایک علم علمِ طلسمات ہے اس میں بھی کام کیا ہے، جتنا بڑا منجّم ہوتا ہے اتنا ہی بڑا ماہرِ طلسمات ہوتا ہے۔

دنیا کی آبادی اور بارہ بروج :

دنیا کی آبادی کو ہم بارہ بروج میں تقسیم کرتے ہیں اور ایسا کرنا درست ہے۔ ایک برج کے تین درجات ہوتے ہیں ہر برج کا ہر درجہ مختلف اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ چونکہ کواکب ہر وقت چل رہے ہیں، ہمہ وقت حرکت زن ہیں، اس لئے جس کا جس درجہ کے ساتھ تعلق بنتا ہے ویسے ہی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اخبارات میں شائع ہونے والے کالم "ستارے کیا کہتے ہیں" زیادہ تر لکھنے والے میری طرح اناڑی ہیں۔ اس علم کے ماہر نہیں ہیں لیکن بروج درست ہیں۔

جنّات کو قابو کرنا :

بعض لوگ واقعی جنّات کو قابو کرتے ہیں اور ان سے کام لیتے ہیں، چیزیں منگوالیتے ہیں، حسبِ منشا کام کروالیتے ہیں، بڑا کچھ کر لیتے ہیں

حتیٰ کہ انسان بھی جِنّ کے ذریعہ بلوائے جاسکتے ہیں۔ میں نے لوگوں کو فضا میں پرواز کرتے دیکھا ہے یہاں لاہور ہی میں ایسے لوگ موجود ہیں۔

سچے خواب :

خواب درست ہوتے ہیں یعنی سچے ہوتے ہیں خوابوں کا سچا ہونا خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہوتا ہے۔

ٹیلی پیتھی :

ٹیلی پیتھی یہ ہے کہ میں یہاں سے کہیں اور کسی اور مقام پر موجود کسی شخص کو پیغام دینا چاہوں، اور وہ پیغام اسے موصول ہو جائے۔ مثلاً میں چاہوں کہ فلاں صاحب میرے پاس آ جائیں اور وہ آ جائیں یہ ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔

کشف :

کسی جگہ کسی مقام پر رونما ہونے والے واقعہ کی بابت معلوم ہونا کشف ہے، دوست، عزیز و اقارب کے بارے میں حالات کا معلوم ہو جانا، یہ ریاضت سے بھی علم حاصل ہوتا ہے، حسنِ اتفاق سے بھی اور قدرت کی طرف سے بھی ودیعت کیا جاتا ہے۔

سوال :۔

آپ نے کہا قسمت و تقدیر کو علمِ طلسمات کے ذریعہ بدلا جا سکتا ہے، کیا یہ خدائی کاموں میں مداخلت کرنے کے مترادف ہے؟

جواب :۔

یہ بالکل خدائی کاموں میں دخل اندازی کے مترادف ہے' انسان نے ایٹم بم بنایا' ایسا ہونا قدرت سے لکھا ہوا تھا کہ اسی طرح ہو گا اور یہ دخل اندازی بھی اس کی رضا سے ہے۔ اس سے گڑ بڑ کا کوئی امکان نہیں۔ قرآن پاک میں طلسم کے بارے میں ایک واقعہ آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر گئے اور اپنے بھائی کو اپنا نائب مقرر کر گئے۔ حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سامری جادوگر نے بچھڑا بنا دیا' اس نے کمال یہ کیا کہ حضرت جبرائیلؑ کے گھوڑے کے پاؤں کے تلے کی مٹی لی اور وہ بچھڑے کے منہ میں ڈال دی اور وہ بچھڑا بول پڑا' وہ ساری قوم جسے حضرت موسیٰؑ راہ راست پر لائے تھے وہ اس بچھڑے کی پوجا کرنے لگی۔ ایک اور جادو کا واقعہ یہ ہے کہ دربار میں رسیاں پھینکی گئیں اور وہ سانپ بن گئیں۔

سوال :۔

کیا ان علوم کو انسان کے فائدے اور نقصان دونوں کے لئے یکساں استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب :۔

ظاہر ہے کہ اگر آپ کے ہاتھ میں چھری ہے تو آپ جیسے چاہیں اسے استعمال میں لائیں گے' اس چھری سے آپ ہر طرح کا پھل کاٹ سکتے ہیں اور شہ رگ بھی کاٹ سکتے ہیں۔ ان علوم کی بدولت طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ انسان جیسا چاہے کر سکتا ہے۔

تعویذ گنڈے:

تعویذ گنڈے قطعی اثر پذیر ہوتے ہیں' شرط یہ ہے کہ کرنے والا اس علم سے واقف ہو۔ یہ ایک باقاعدہ علم ہے جسے "علمِ نقش" کہا جاتا ہے۔

سوال :۔

کیا غیر مسلم تعویذ کر سکتے ہیں؟

جواب:۔

یہ اصل میں علم الاعداد ہے جیسے ۷۸۶ کا مطلب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب سے متعلّق لوگ اعداد بنا لیتے ہیں اور اپنے کام میں لاتے ہیں۔

سوال :۔

کیا واقعی سنجوگ آسمانوں پر طے ہوتے ہیں؟

جواب :۔

اس امر پر آپ بھی یقین کرتی ہیں کیونکہ اپنی مرضی سے آپ اس دنیا میں نہیں آئیں' نہ آپ نے اپنی مرضی سے جانا ہے' اس آنے اور جانے کے درمیان کا عرصہ جسے زندگی کہا جاتا ہے' کیا انسان اس عرصہ کے دوران خود کو آزاد اور خود مختار خیال کرتا ہے؟ اگر استفسار کیا جائے کہ کل آپ کیا کر رہی ہوں گی یا سوچ رہی ہوں گی؟ تو اس امر کا جواب آپ نہیں دے پائیں گی۔ لیکن صرف ایک منجّم اس بارے میں جان سکتا

ہے' بتا سکتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کا وارد ہونا اور پھر رخصت ہونا انسان کے نہیں اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر رسی کا ایک سرا ایک ہاتھ میں ہو اور دوسرا سرا کسی ہاتھ میں ہو تو کیا رسی اپنی مرضی سے' اپنی منشا سے حرکت کر سکتی ہے' نہیں کر سکتی۔ بس یہی عالم انسان کا ہے' جب اس کا آنا اور جانا اس کے اختیار میں نہیں تو پھر درمیانی عرصہ جسے زندگی کہا جاتا ہے کیا اسے وہ حسبِ منشاء اور حسبِ مرضی گزارنے پر قادر ہے' ہرگز نہیں۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ وہ زندگی اپنی مرضی سے بسر کر رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے حکم کے بنا ایک ذرّہ بھی حرکت نہیں کر سکتا تو پھر انسان جو مجسّم ذرات ہے کیسے اپنی مرضی سے حرکت کر سکتا ہے۔

سوال :۔

انسان اگر اس قدر عاجز اور بے بس ہے تو جنّت یا جہنّم کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب :۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے علوم کے اظہار سے منع کر دیا گیا ہے اور اسے حرام قرار دے دیا گیا کہ جو معاشرہ میں گڑ بڑ پھیلا سکتے ہیں ایک آدمی کو جب یہ معلوم ہو جائے کہ کل اسے مرجانا ہے تو وہ آج ہی کام چھوڑ کر بیٹھ جائے گا۔ ایک آدمی کو معلوم ہو جائے کہ اسے دوزخ میں جانا ہے' وہ تمام برائیوں کو قبول کر لے گا کہ جانا تو دوزخ میں ہی ہے۔ ان وجوہ سے علماء کرام نے اس کی تحصیل کو جائز قرار دیا لیکن اس کا بیان ممنوع قرار دے دیا' آپ مطالعہ کریں' پڑھیں' غور و فکر کریں' اس امر

پر کوئی پابندی نہیں ہے' لیکن یہ کہنا کہ فلاں وقت تم خرابی کرو گے تو وہاں سے کام خراب ہو جاتا ہے۔

سوال :۔

ایک مکمّل عاجز و بے بس انسان کو کس بنا پر جنّت یا جہنّم ملتی ہے؟

جواب :۔

ہر چیز کی ایک قسمت ہے' لکڑی کی قسمت میں جلنا لکھا ہے' وہ آج جلے' فرنیچر ٹوٹنے کے بعد جلے' سو سال بعد جلے' اسے جلنا ہے۔ اس میں جلنے کا مادہ ہے' وہ جلے ہی جلے۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں آپ انہیں آگ لگائیں' وہ آگ نہیں پکڑتیں۔ وہ جو آگ پکڑتی ہیں ان میں گناہ کا مادہ ہوتا ہے' جو آگ نہیں پکڑتیں ان میں راست بازی و نیکی کا مادہ ہوتا ہے۔ قانون کا احترام ہوتا ہے خدا توازن قائم رکھتا ہے' اس نے روشنی کے ساتھ تاریکی پیدا کی ہے' جن لوگوں کو جہنّم ملتی ہے وہ ان کے اعمال کے سبب ہے۔

سوال :۔

اور یہ جبر و قدر کا فلسفہ؟

جواب :۔

ایک شخص نے یہی سوال حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا' آپؓ نے فرمایا ایک پاؤں اٹھا کر دوسرے پر کھڑے ہو جاؤ۔ اس نے ایک پیر اٹھا دیا پھر فرمایا اب دوسرا پیر بھی فضا میں اٹھاؤ وہ نہ اٹھا سکا۔ آپؓ

نے کہا بس انسان اسی حد تک آزاد ہے اور اسی حد تک پابند' تو اتنی آزادی اس کے کس کام کی جو اس کے لئے بے معنی و بے سود ہے۔

سوال :۔

قسمت اور یہ علوم کیا قوموں کے عروج و زوال پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں؟

جواب :۔

قوموں اور ملکوں کے عروج و زوال کے ادوار ہوتے ہیں۔ جس کا دورِ عروج ہوتا ہے وہ بامِ عروج پر پہنچتا ہے اور جس کا دورِ زوال ہوتا ہے وہ ملک زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ عروج کے دور میں خود بخود قومیں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ ان میں ایک خاصیّت پیدا ہو جاتی ہے جو انہیں محنت و ترقّی کی جانب مائل و راغب کرتی ہے۔ جس قوم کا بیڑا غرق ہونا ہوتا ہے وہ لہو و لعب میں پڑ جاتی ہے' ایسے علوم کے حامل افراد کی بھی اپنی حدود ہیں۔

سوال :۔

کیا یہ علوم اور ان کا استعمال و اظہار غیر اسلامی ہے؟

جواب :۔

میں ایک مسلمان ہوں اور میں نے علم نجوم سیکھا' جس امر نے مجھے سب سے زیادہ ترغیب دی وہ حضرت علیؓ کا یہ بیان ہے کہ فلاں فلاں ایّام میں فلاں فلاں کام کرنے چاہئیں۔ اور وہ ایام اور کام مخصوص

کواکب سے منسوب تھے اور اسی بنا پر انہوں نے ایسی ہدایت کی تھی۔ پھر سب سے بڑی اساس قرآن پاک ہے اس میں کہیں مخالفت نہیں آئی، ان علوم کا ثمرہ لینے کی ممانعت نہیں آئی، اس امر سے قرآن پاک منع نہیں کرتا۔

قرآن پاک کی ایک اور آیتِ مبارکہ ہے "سورج، چاند، ستارے اللہ کے حکم سے مسخّر ہیں، تحقیق کی یہ نشانیاں ہیں"۔ عقل مند لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نشانیاں قرار دے رہا ہے، اس نے کب ممانعت کی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ ہم سے زیادہ اسلام کو سمجھتے تھے، انہوں نے ایک کتاب لکھی اور اس کتاب میں یہ درج ہے کہ اس دنیا کے لئے احکامِ الٰہی جو ہیں ان پر کس طرح عمل درآمد ہوتا ہے۔ وہ انہی کواکب کا ذکر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ چاہتے ہیں وہ عرش پر آتا ہے۔ عرش سے کواکب پہ ان کا ظہور ہوتا ہے اور دنیا میں وہ کچھ نافذ ہو جاتا ہے۔ جالینوس کہتا ہے جب آسمان پر زحل اور مریخ کا قران ہوتا ہے اور جن بروج میں یہ قران ہوتا ہے ان بروج سے متعلقہ علاقوں کی زمین ایک خاص قسم کی بھاپ خارج کرتی ہے جس کے باعث بعض لوگ جسم پر چھالوں کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اس مرض کو چیچک کہتے ہیں۔ جن افراد کے جسموں میں مواد ہوتا ہے وہی چھالوں میں گرفتار ہوتے ہیں یا جن کے جسموں میں اثر قبول کرنے کی صلاحیّت ہوتی ہے ان کا جسم اس مرض کا شکار ہوتا ہے۔

سوال :۔

چیچک کا یہ مرض آج دنیا میں ناپید ہے کیا یہ محض

ستاروں کے باعث ہے' ڈاکٹروں اور اداروں اور حکومت کی پالیسیوں کا کوئی دخل نہیں؟

جواب:۔

بیماریوں کے ادوار ہوتے ہیں' ایک زمانہ تھا جب بخار کو لاعلاج تصوّر کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پھر ایسا زمانہ آیا کہ بخار کے ساتھ گلٹی نکلنے لگی جو طاعون کہلائی اور وہ لا علاج مرض قرار دیا گیا۔ اس کے بعد چیچک کی باری آئی' اس کی جگہ ٹی بی نے لے لی اور آج کینسر براجمان ہے' یہ ادوار ہوتے ہیں۔ بیماریوں کی بھی ایک حد ہے کہ قابو آتی ہے' چیچک ناپید ہے۔ ٹی بی اور بخار وغیرہ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بیماریوں کے دور ہوتے ہیں' آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ستارے بذاتِ خود تو کچھ نہیں کرتے ہر آدمی جو پیدا ہوا اس کے کچھ ستارے ہیں وہ ان کو انگیخت کرتے ہیں کہ یہ کام کرو۔ ان کے اندر کام کرنے کی جبلت ہوتی ہے' ریسرچ کرنے کی لگن ہوتی ہے۔ غذا سے تعلّق رکھنے والے ڈاکٹر لوگ حفظانِ صحت سے متعلّق ادارے اور دیگر افراد کام کرتے ہیں۔ اپنے ستاروں کے تحت تو یہ افراد ایک ذریعہ بنتے ہیں کام کروانے کا۔

پروفیسر ایم اے ملک

میرا تعلّق علم پیرا سائیکالوجی سے ہے یعنی علم مابعد النفسیات سے' ایسے علوم جن کا تعلّق پُر اسرار علوم سے ہے جو وجدان' مشاہدہ

باطن، مخفی علوم پر مبنی ہیں۔ ان علوم میں ٹیلی پیتھی، علمِ ارواح، تعبیر خواب، علم الاعداد، آسٹرالوجی، دست شناسی شامل ہیں۔ ان تمام علوم کا میں نے مطالعہ کیا ہے اور عملی تجربہ دست شناسی کے میدان میں کیا ہے۔ میری نظر میں یہ علوم سائنسی علوم سے متصادم نہیں بلکہ انہیں اس سے مختلف اور ماورا تصوّر کرتا ہوں کیونکہ ان علوم کا تعلّق مادی محسوسات سے نہیں، معروضی حقائق سے نہیں۔ وہ لوگ جو ان علوم کی نفی کرتے ہیں ان سے محض یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی امر کی عدمِ واقفیت سے اس کا عدمِ وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اس کائنات میں لاکھوں ایسے حقائق موجود ہیں جن پر ہمارا شعور اور اِدراک حاوی نہیں ہے۔ روح کی حقیقت کو بھی پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ سچے خواب، دست شناسی، علم الاعداد، ستاروں کا علم، وجدانی کیفیّات، ٹیلی پیتھی، جادو کی حقیقت اور اسی نوع کے ہزاروں موضوعات ایسے ہیں جن کی عقلی یا سائنسی توجیہ اب تک سامنے نہیں آ سکی۔ لیکن اس سے ان کا عدم وجود ثابت نہیں ہوتا۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ انسان کا اپنی ذات اور کائنات کے بارے میں علم جوں جوں بڑھتا جائے گا ان علوم کی کھلی توجیہہ بھی ممکن ہوتی جائے گی۔ علم مابعد النفسیات کی جانب انسان کا حالیہ رجحان اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان اب "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی" حاصل کرنے کی جستجو کر رہا ہے۔ ان علوم کے طفیل وہ حقائق جنہیں کچھ عرصہ پیشتر توہمات سے وابستہ کیا جاتا تھا، وہ رفتہ رفتہ سائنسی حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں۔ وہ چیز جسے جادو، ٹونا کا نام دیا جاتا تھا آج ہپناٹزم اور مسمریزم کی شکل میں سائنسی حقیقت بن چکے ہیں اور علمِ

نفسیات کا باقاعدہ جزو ہیں۔ ان کی مدد سے ماہرینِ نفسیات ذہنی امراض کا علاج بھی کر رہے ہیں۔ گویا ثابت ہوا کہ جادو بر حق ہے۔

ٹیلی پیتھی:

حضرت عمرؓ نے اپنا روحانی پیغام ٹیلی پیتھی کے ذریعہ اپنے سپہ سالار کو دیا تھا کہ وہ پہاڑی کے عقب سے دشمن پر حملہ آور ہوں۔ یہ پیغام انہوں نے جمعہ کے خطبہ کے دوران دیا تھا۔ اب اس ٹیلی پیتھی کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔ اب ٹیلی پیتھی کو سائنسی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے اس مضمون پر سب سے زیادہ تحقیقی کام کمیونسٹ ملک روس میں ہو رہا ہے۔ وہاں تصوّف کی جانب رحجان بھی فروغ پذیر ہے۔

علمِ ارواح:

اس مضمون کا مغربی ممالک میں کافی عرصہ سے رواج ہے۔ عظیم ماہرِ نفسیات کارل ژونگ ان علوم کا زبردست قائل تھا اور اسی بنا پر فرائڈ نے کہا تھا کہ یہ سائنس دان کے بجائے صوفی بن گیا ہے۔ کارل ژونگ نے ارواح سے رابطہ قائم کرنے کا کام کیا تھا۔ وہ روح بلانے کے علم پر حاوی تھا' جدید دور میں انسان کے حواسِ خمسہ کے علاوہ چھٹی حس کا نظریہ ماہرینِ نفسیات نے زبردست دلائل کی بنیاد پر قائم کیا اور چھٹی حس ای ایس پی .E.S.P کے بارے میں خبر دی۔ سائنس دان پانچ حواس کے تو قائل ہیں لیکن چھٹی حس ان کی گرفت میں نہیں آ سکی۔ تاہم اس سے انکار تعصّب انگیزی کی علامت ہے۔ حس ماورائے اِدراک .E.S.P

آنے والے دور کی قبل از وقت اطلاع دیتی ہے اور یہ زمان و مکان سے ماورا ہے۔ اس کا وجود جانوروں میں بھی ثابت ہوا ہے۔ آفات سے قبل کتے' بلیاں چلانے لگتے ہیں۔ انسان کے اندر ایسا راڈار سسٹم ہے' ایسی مخفی قوتیں ہیں جن سے انسان پوری طرح آگاہ نہیں۔ اگر انسان ارتکاز نظر سے کام لے تو ان علوم کی نشو و نما کی جا سکتی ہے۔ ان کی تربیّت کی جا سکتی ہے' توہمات میں نظر لگنا ایک حقیقت ہے۔ نگاہ میں تسخیری قوت پنہاں ہوتی ہے۔ گہری نگاہ سے دیکھنے سے شیشہ چٹخ جاتا ہے' پتھر پھٹ جاتا ہے۔ بعض انسانوں کو "نظر" ودیعت کی گئی ہوتی ہے وہ پتھروں کو دو ٹکڑوں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ اسی سے معجزہ کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ آنکھ سے ہپناٹائز کرنے کا مشاہدہ عام ہے' سانپ کی نظر کی گرفت میں اگر کوئی پرندہ آ جائے تو پرواز کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایک حلقہ سائنس دانوں کا ان علوم کو غلط اور ایک حلقہ اسے گناہ خیال کرتا ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ اگر سائنس دان جامد و ساکت ہو جائے تو وہ خطرناک ہے۔ جو لوگ سائنس کو مذہب بنا لیتے ہیں وہ سائنس کی اساس کو منہدم کر رہے ہیں اور اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو کسی چیز کو محض اس بنیاد پر تسلیم یا انکار کرتا ہے کہ آیا وہ چیز بہبودیٔ انسان کے لئے ہے یا ان کے لئے باعثِ نقصان ہے۔ اسلام نے ان سے انکار نہیں کیا لیکن اس کے مضر استعمال پر پابندی لگا دی' اس لئے کہ ان علوم کے غلط استعمال سے بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً" میاں بیوی کے نازک رشتہ میں فساد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی مدد سے مستقبل کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ فرعون کو کاہنوں نے اطلاع دی کہ

حضرت موسیٰؑ پیدا ہوں گے۔ گویا کوئی علم ایسا ہے جس کے ذریعہ اطلاع فراہم کی گئی۔

واصف علی واصف صاحب

اسلام اور دیگر مذاہب نے کسی انسان کی ذاتی زندگی میں دخل دینے یا اس بارے تجسّس سے منع کیا ہے۔ چار دیواری کے اندر کے واقعات یا لباس میں پوشیدہ واقعات کا اظہار کرنے والا علم سچا ہونے کے باوجود غیر اسلامی ہے۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو کسی ملنے والے کو فوری طور پر بتا سکتے ہیں کہ اس کی ذاتی، خانگی، معاشی اور جذباتی احساساتی زندگی کس نوع کی ہے۔ تاہم اس نوعیّت کے چونکا دینے والے واقعات کا اظہار ممنوع ہے، اس نوع کا علم عرفان یا روحانیّت سے متعلّق نہیں بلکہ عملیات کا حصہ ہے اور وظائف کا مرہونِ منت۔ پاک پتن کے نواح میں ایک مائی صاحبہ ہیں وہ سورت رحمٰن کی عامل ہیں اور وہ دوسروں کا تمام حال بیان کر دیتی ہیں۔ یہ علم مبنی بر صداقت ہونے کے باوجود قرآن پاک کی رو سے ممنوع ہے۔

زائچہ :

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ جو سب سے بڑی مہربانی فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اسے آنے والے کل سے باخبر نہیں رکھا۔ قرآن پاک کی رُو سے تین امور کی بارے میں انسان کوئی علم نہیں رکھتا۔ (۱) ماں کے

رحم میں کیا ہے؟ اس سے کوئی باخبر نہیں ہوتا۔ (۲) آنے والے کل کیا کرنا ہے؟ (۳) کون سی زمین میں دفن ہونا ہے؟ لوگ ان تین امور کو جاننے کے خواہشمند ہوتے ہیں اور وہ جان لیتے ہوں گے' اس جاننے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے جس آدمی نے آنے والے کل کو دیکھتے رہنا ہے اس کی نظروں سے حال اوجھل ہو جائے گا' اسی طرح جس طرح آسمان کو دیکھنے والے کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ہر انسان اس امر سے واقف ہے کہ اسے مرجانا ہے۔ اگر اسے مرنے کی تاریخ بتا دی جائے تو آج ہی مر جائے گا۔ مستقبل کے بارے میں یہ آگہی اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہمیں مستقبل جاننے کا شوق ہوتا ہے۔ اگر مستقبل کی جانب نگاہ دوڑانا ہی ٹھہرا تو کل پرسوں تک کیوں محدود رہیں۔ کیوں نہ آخری مستقبل تک نگاہ دوڑائیں۔ اس حد پر آکے معلوم ہوگا کہ زندگی کو تمام ہونا ہے' فرشتوں کو اعمال کا حساب کتاب لینا ہے تو پھر زائچہ کا حساب کتاب غیر ضروری ہے۔ مستقبل کی پیش گوئی عملیات کے ذریعہ کرنا زائچہ ہے یہ تاریخ پیدائش اور ستارہ کی مدد سے مرتب کیا جاتا ہے' گویا یہ روحانی کیمرہ ہے جو اس انسان کے اعمال کے نتیجہ میں مرتب ہونے والے ممکن مستقبل کا فوٹو لے رہا ہے لیکن اگر گناہ گار انسان کو توبہ کی توفیق ہو جائے تو پیش آنے والا ممکن عذاب ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایک نام' ایک تاریخ اور ایک ہی ستارے کے تحت پیدا ہونے والے بچے یکساں تاثیر کے حامل نہیں ہوتے۔ محمد علی بڑا نام ہے' بانیٔ پاکستان کا نام ہے' عالمی شہرت کے حامل کا نام ہے' لیکن میرے ملازم کا بھی یہی نام ہے۔ یہ فطرت ہے' قدرت نے فطرت مقرر کی ہے' ان پر ستاروں کے

اثرات فطرت کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔ مثلاً" اگر ستارے اچھی حالت میں ہیں تو جس کا عمل چوری ہے وہ اچھا چور بن جائے گا' جس کا نیکی ہے وہ نیک بن جائے گا' زائچہ سے شخصیت کلی طور پر مقرّر نہیں ہوتی۔ موٹے موٹے خطوط اور خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ بہتر ہے کہ انسان علامہ اقبالؒ کی بات مانتے ہوئے کہہ دے ۔

ستارہ کیا تیری تقدیر کی خبر دے گا

وہ خود فراخئ افلاک میں ہے خوار زبوں

اس بے چارے ستارہ کو خود کوئی رستہ نہیں ملتا۔ زائچہ کا علم غلط نہیں ہے لیکن غیر ضروری ہے' علم صحیح ہے اور استعمال غیر ضروری۔

روحوں سے ہم کلام ہونا :

قبروں کا حال جاننے کا علم درست ہے۔ مردے کی روح سے ملاقات ممکن ہے۔ ان سے ہمکلام ہوا جا سکتا ہے۔ داناؤں' بزرگوں' سقراط' قلو پطرہ' ہیلن' بدھ ان تمام کی ارواح سے ملاقات اور اکتساب ممکن ہے لیکن ان سے ملاقات دین نہیں ہے۔ دین یا مذہب انسان پر جو فرض عائد کرتا ہے اس میں عبادت خود آگہی اور زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرنا شامل ہے۔ یہ مشاغل درست ہوسکتے ہیں لیکن غیر ضروری ہونے کے سبب ان سے احتراز کرنا چاہئے۔ اس سے بڑا اور کیا روحانی واقعہ ہو سکتا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ہمہ وقت دو فرشتے رہتے ہیں لیکن اپنے ہمراہ ہمہ وقت رہنے والے دو فرشتوں سے علیحدہ علیحدہ ملاقات بہت کم لوگوں کی ہوئی ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ نہیں ہوئی ہے پھر زمانے کی خبروں' دور کی خبروں کا کوئی فائدہ نہیں' یہ بے سود ہے۔

تعویذ گنڈے، نقش :

الفاظ کی تاثیر مسلّم ہے اللہ ذات ہے، اس ذات کا اسم اگر کاغذ پر تحریر کیا جائے تو وہ کاغذ ماننے والے کے لئے ایک مقدّس دستاویز سے کم نہیں، احساس سے الفاظ میں تقدیس پیدا ہوتی ہے اور تقدیس ہی تعویذ کا اثر ہے۔ کبھی کبھی ایسے تعویذ بھی لکھے جاتے ہیں اور لکھنے والا اس ظلم میں شریک ہوتا ہے جس تعویذ کے باعث کسی انسان پر سختی یا پریشانی کا اثر ہو، میں نے اس سے قبل یہ کہا ہے کہ الفاظ کا اثر ہوتا ہے، گالی کا اثر ہوتا ہے، دعا کا اثر ہوتا ہے "ہمیں آپ سے محبت ہے" یہ فقرہ انسان کی زندگی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ انہیں تعویذ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کچھ تعویذ مؤکّلات کے ذریعے کئے جاتے ہیں اور وہ مؤکّل ان تعویذوں کی نگرانی کرتے ہوئے اپنا اثر نافذ رکھتے ہیں۔ مثلاً" جس کے خلاف تعویذ کیا گیا اس کی یادداشت کمزور ہوگئی، اس کے کام کے آغاز میں الجھنیں درپیش آئیں، اس کی توجہ مرکزیت کھو بیٹھی اور انتشار کاشکار ہوگئی، یہ ممکن ہے۔

تعویذوں سے بچاؤ کا طریقہ کار :

اللہ کریم کا حکم ہے کہ یہ دعا کرنی چاہئے، اے اللہ مجھے بچا لوگوں کے شر سے اور اس شر سے جب وہ گرہ لگاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ پناہ مانگی جائے ان لوگوں سے جو انسان کے دل میں وسوسہ ڈالیں۔ وسوسہ یقین کی ضد ہے یعنی خدا کی رحمت پر اعتقاد کے بجائے وسوسہ پیدا ہوجائے۔ ایسا کرنے والے انسان بھی ہو سکتے ہیں اور جنات

بھی۔ تعویذوں سے محفوظ رہنے کے لئے ایک تعویذ ہونا چاہئے' وہ ہے خود کو ہر حال میں اللہ کے حوالے کیا جائے' اپنے اعمال کو اس کے سپرد کیا جائے' نمازاور صبر کا سہارا لیا جائے' نماز پڑھنے والے عام طور پر منفی اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔

جِنّات :

بہت سارے مفسّروں نے جن کی الگ الگ تشریح کی ہے۔ جِنّ قوّت کو بھی کہتے ہیں جو انسان کی اپنی صلاحیّت ہے۔ کچھ لوگوں نے غصہ کو بھی جِنّ کہا ہے لیکن خدا کا یہ ارشاد ہے کہ اے انسانوں کے گروہو' اور جِنّات کے گروہو! اگر تم نکلنا چاہو زمین و آسمان کے حصارے سے تو نکل کے دیکھو۔ مطلب یہ ہوا کہ جِنّات الگ مخلوق ہیں' انسان الگ مخلوق ہیں' لیکن ایک چیز یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کوئی فرشتہ یا کوئی جِنّ انسانی دنیا میں بالعموم اپنی ذاتی شکل میں سامنے نہیں آئے گا۔ انسانی دنیا میں غیر مرئی وجود جب کبھی کسی وجہ سے آئے گا تو انسانی شکل میں آئے گا۔ اللہ کریم نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر یہ اللہ کے سچے نبیؐ ہیں تو ان کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں رہتا؟ اللہ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! اگر ان کے ہمراہ فرشتہ ہوتا تو تب بھی وہ انسانی شکل میں ہوتا' تمہارا سوال وہیں کا وہیں رہتا۔ ہم نے جس قدر جِنّات کے قصے' واقعات مشاہدہ کئے ہیں اور کسی انسان پر جِنّ کا سایہ بتایا جاتا ہے' بس یہیں تک سچ ہے اس سے آگے نہ انکار کرنے کی ضرورت ہے نہ اسے گرفتار کرنے کی حاجت۔ یہ مخلوق اپنی دنیا میں موج کرے' انسان اپنی دنیا

میں مگن رہے، جن ہماری دنیا میں ایسے نہیں آتے۔ جنّات اور انسانوں کے مابین کوئی باہمی رشتہ نہیں ہے۔ کتابوں میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت محدث دہلویؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت وڈے میاںؒ کے درس میں جن قرآن شریف پڑھا کرتے تھے۔ جنّات بھی مختلف مذاہب سے تعلّق رکھتے ہیں، اس مرئی دنیا کے اندر ایک اور دنیا ہے جو غیر مرئی ہے۔ اس پر ریسرچ ہو رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جس آگ میں گئے وہ گلنار کیسے ہو گئی۔

جادو (کالا علم) :

کالا علم موجود ہے۔ اگر آپ ایمان سے باہر ہو جائیں تو کالا علم رکھنے والا میاں بیوی کے درمیان فوراً جھگڑا کرا سکتا ہے، کھوپڑی کا علم بھی ہے۔ حضرت بابا فرید شکر گنجؒ جذب میں تھے کہ چڑیاں شور مچا رہی تھیں، آپؒ نے زور سے انہیں گھورا، وہ مرگئیں۔ پھر ان کے لئے دعا کی اور وہ اڑ گئیں۔ اس کے بعد حضرت فرید گنج شکرؒ کہیں جا رہے تھے دیکھا کہ ضعیفہ کنواں میں سے پانی نکالتی ہے، نکال کر بہا دیتی ہے۔ اسے بار بار یہ عمل کرتے دیکھا تو کہا تُو یہ کیا کر رہی ہے، بڑھیا بولی میری بہن کے گھر کو آگ لگ گئی ہے اس کو سرد کر رہی ہوں۔ آپؒ نے فرمایا یہاں پانی بہانے سے اس کے گھر کی آگ کیونکر سرد ہو گی۔ وہ بولی یہ بھی کوئی چڑیا ہیں جنہیں تو نے گھور کر دیکھا تو وہ مرگئی۔ چنانچہ یہ علم ہوتا ہے۔ نظر آنے والی دنیا اپنے اندر ایک غیر مرئی دنیا رکھتی ہے اور وہ بایقین ہے۔ اسے احساس کی دنیا کہیں، لطائف کی دنیا کہیں، حسن کی دنیا، حواس کی دنیا،

ماضی کی بازگشت کی دنیا' مستقبل کی اطلاع دینے کی دنیا کہیں' یہ ہے ضرور۔ کبھی کبھی آسمان زمین کی دنیا میں دخل دیتا ہے' کبھی زمین آسمان کی دنیا میں دخل دیتی ہے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن کے اثرات زمین پر بسنے والے انسانوں پر پڑتے ہیں۔ حاملہ عورت ان سے بطورِ خاص متاثر ہوتی ہے' زمین والے جب آسمان سے دعا کرتے ہیں اور انہیں آسمانوں سے نور ملتا ہے۔ اس طرح زمین آسمان کی دنیا میں مخل ہو جاتی ہے۔ زمین و آسمان ایک دوسرے پر اثر کرتے ہیں۔

روحانیات :

ایک اور شعبہ ہوتا ہے روحانیت۔ لوگ جب کہتے ہیں "جا ہو جا" تو یہ نہیں کہ وہ خود کرتے ہیں بلکہ خدا سے دعا کرتے ہیں۔ اپنے "لفظ" کی نگرانی کرتے ہیں' دعا کی مدد سے۔ اس لئے ان کی بات سچی ثابت ہوتی ہے۔ یہ میرا نسخہ ہے کہ اگر ایک شخص چالیس روز تک فیصلہ کرے کہ سچ بولے گا تو چالیس دن بعد اس کے منہ سے نکلی ہر بات پوری ہوگی' خدا اس کی بات سنے گا' بزرگوں کی بات صداقت فکر اور دعا سے پوری ہوتی ہے' بنا تعویذ کے' بغیر عمل کے۔ روحانیّت اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو منظور کرنا' تسلیم کرنا ہے' اپنے فیصلے منظور کرانا نہیں۔ ؎

تو نے بخشا مجھے یہ قلبِ سلیم
کیوں نہ ہوں تیرے فیصلے تسلیم

جس کے پاس یہ کلمۂ تسلیم ہو اس کے پاس روحانیّت ہے۔ وہ دعاؤں سے بھی گریز رکھتا ہے کہ میرا مالک اس کو دعا کے بغیر دے رہا ہے

اور میرا کام یہ ہے کہ اس کی رضا سے رہوں اور جب وہ بلائے گا تو آنے
کو تیار رہوں' روحانیّت کا یہ فیصلہ جب تسلیم ہو جاتا ہے تو اپنی روح کی
رہنمائی کے لئے کوئی روح ہوتی ہے' اسے نسبت یا وسیلہ کہتے ہیں۔
ہمارے ہاں یہ نسبتیں طریقت کہلاتی ہیں' حال کی زندگی میں ماضی کے
بزرگوں اور سرکار دو عالمؐ کی اپنی ذات گرامی سے باطنی اکتساب کرنے کے
لئے سلاسل طریقت وجود میں آئے اور جہاں حال اپنی تمام تر صلاحیتوں
اور مساعی کے باوجود انسان کے بس میں نہ ہو' وہاں باطن ایک صفت کے
طور پر انسان کی اعانت کو موجود ہوتا ہے اور اسے کہتے ہیں ....
فیض۔ ہم جس ذات کو پکارتے ہیں وہ ذات اپنے اسم کے تقدّس کی خاطر
ہمہ حال اپنے اسم کے ساتھ نگران کے طور پر موجود رہتی ہے' اس لئے
اچھے بزرگوں کے اسماء پکارنے سے ہمیں اس بزرگ کی شفقت یا عنایت
کا کچھ احساس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جس طرح صحراؤں' جنگلوں' بے
سمت راہ گزاروں میں ہم جب پکارتے ہیں تو راہ دکھانے والا روحانی شعور
عطا کرتا ہے۔ اسی طرح جس طرح پرندوں کو اسی فضائے بسیط میں رات
کی تاریکی میں راہ دکھانے والا رستہ دکھاتا ہے۔ یہ کوئی امر تعجب نہیں۔
اللہ کریم کا ارشاد ہے کہ اس نے شہد کی مکھی کو الہام عطا کیا کہ وہ شہد
بنائے۔ معمولی کیڑے کو شہد بنانے کا فن عطا کرنے والی ذات روحانیّت کی
نگرانی کرتی ہے۔ ہمیں ہمارے اعمال کی عبرت سے بچانے کے لئے توبہ کا
رستہ دکھاتی ہے اور ہمیں ان لوگوں کے وسیلے سے مطلع کرتی ہے جن پر
اللہ کا انعام ہو چکا اور وہ اتنے حقیقی ہوتے ہیں کہ ظاہر کی دنیا ایک خواب
سا نظر آتی ہے۔ خواب دو بیداریوں کے زمانوں کے درمیان حالت نیند

میں کسی عمل کی آگہی کا نام ہے۔ مثلاً" نیند سے پہلے جاگتے تھے' نیند کے بعد پھر جاگتے ہیں' اسی طرح زندگی سے قبل خدا کے پاس تھے' زندگی کے بعد پھر خدا کے پاس ہوں گے' گویا دوران زندگی جو کچھ ہو رہا ہے خواب ہے۔ پیغمبروں کے خواب امرِ الٰہی ہوتے ہیں' کچھ خواب استعارے کی شکل میں آتے ہیں ان کا مفہوم ان کی تعبیر کے حوالے سے جانا جاسکتا ہے۔ خوابوں کے سچا ہونے کی شرط یہی ہے کہ خواب دیکھنے والا معصوم ہو' پاکیزہ ہو' لالچ اور خوف سے آزاد ہو' یہ دونوں امور بے حد ضروری ہیں۔ درود شریف پڑھنے والے بھی اکثر سچے خواب دیکھتے ہیں' استخارہ بھی خواب ہے' آگہی کا ایک اسلامی انداز۔

نظر:

نظر دراصل ایک آہ ہے جو دیکھنے والے کے دل سے نکلتی ہے اور وہ صفت کسی نہ کسی نقص میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کبھی حاسد' کبھی چاہنے والے کی نظر لگتی ہے۔ کبھی ماں باپ کی نظر لگ جاتی ہے اور بہت کم لیکن ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی نظر لگ جاتی ہے۔ اس سے بچنے کے لئے دعا ہے کہ اللہ چشم بد سے بچائے۔ اس کے لئے صدقہ دیا جانا بے حد مناسب ہے۔

توہم پرستی :

جب ہم خدا کا نام لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ خدا ظاہر ہے' باطن ہے' اول ہے' آخر ہے' شاہ رگ سے قریب اور انسان سے بہت دور زندگی دیتا اور زندگی لیتا ہے۔ ایسی صفات جو بظاہر متضاد ہیں ماننے والوں

کے لئے کوئی مربوط عقیدہ نہیں بنا پاتیں تو لا علمی کی بنا پر جاہل لوگ توہم پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ توہم پرستی جاہلوں کا آسرا ہے' اس حوالے سے ہندوستان کے باقی مذاہب اور ان کی توہم پرستی نے خاصا کردار ادا کیا ہے۔ اگر ہم اپنے سماج کو صحیح معنوں میں توحید و رسالت اور منشائے اسلام سے آگاہ رکھیں تو توہم پرستی کے شیش محل از خود ٹوٹ جاتے ہیں آج ہم سڑکوں پر کالے بکرے کا سرا پڑا دیکھتے ہیں کچھ تاریخیں منحوس خیال کی جاتی ہیں' کچھ انسان بد شگون تصور کئے جاتے ہیں' یہ سب توہم پرستی کی علامتیں ہیں اور توحید پرستی ہی اس سے نجات کا رستہ ہے۔

انسانوں کا پرواز کرنا :

انسان بھی پرواز کر لیتے ہیں۔ یہ کشش ثقل کے مقابل لطافت کا حاصل کرنا ہے۔ آج کے عہد میں کئی جوگی' کئی سادھو اپنے مریدوں کو Hopper بنا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوا اڑے تو کوا ہی رہے گا' شاہین بیٹھا ہو تو شاہین ہی رہے گا۔ فطرت نہیں بدلتی۔ صفات میں ارتقاء پیدا کرنا مقصود نہیں ہے' ترقی مدعا نہیں ہے' مدعا تقرّبِ حق کی خواہش ہے۔ اگر تقرّبِ حق چھوڑ دیں تو ہمارا ہر ارتقاء' ہر کامرانی عبرت کے علاوہ کچھ نہیں' اگر تقرّبِ حق خواہ بظاہر ناکامی ہو' خواہ شہادت ہو' ایک بہت بڑی کامرانی ہے' کربلا میں شہید ہونے والے امامؑ کامیابی کی انتہاء ہیں۔ ہمارا ہر وہ عمل درست ہے جو فطرت سے مطابقت رکھتا ہو' اڑنا کوئی بڑی بات نہیں' پرندے اڑنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جسمانی طاقت بڑی بات نہیں' ہاتھی بہت بڑی طاقت ور شے ہے۔ جو چیز انسان کو

اشرف بناتی ہے وہ اس کا ادراک، ضمیر اور پہچان ہے' اس کی روح اور روح کی لطافت ہے' اس کا مظہر خداوند ہونا ہے' اس کا سب سے بلند مقام وہ ہے جو حالتِ سجدہ میں ہوتا ہے' اس وقت انسان اپنی روح کی پرواز میں عروج میں ہوتا ہے۔ گنڈا کرنے والے ظالم خسارے میں رہتے ہیں۔ اسلام نے انہی کاہنوں سے نجات دینے کے لئے توحید کا رستہ دکھایا۔ قرآن کریم کی ہر آیت پورا اثر رکھتی ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم زائچہ کے لئے' موکلوں کے لئے اور تعویذوں کے لیے عطا نہیں ہوا یہ راہ ہدایت ہے اور راہ نجات ہے۔

دست شناسی :

ہاتھ کی لکیریں عام طور پر بہت کچھ بتاتی ہیں' ہماری تقدیر کا بہت سا حصہ دوسروں کے ہاتھ پر ہے' وہ جن کی صحبت میں ہم ہمہ وقت رہتے ہیں مثلاً" میرے ہاتھ پر اگر محبت کی لکیر ہے اور میرے محبوب کے ہاتھ پر یہ لکیر معدوم ہے تو اپنی لکیر کو دیکھ دیکھ کر محبت کرنا نادانی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ کی لکیریں آسمان کے ستاروں کی مانند اپنے حلقہ غور میں لائیں۔ خدا کی رحمت پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کو اپنے اعمال ہی سے نہیں اس کے احسان اور اس کی رحمت اور اس کی رحمت والے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلق دیکھیں تو ہاتھ کی لکیریں بے معنی ہو جاتی ہیں' ہرچند کہ یہ علم درست ہے لیکن غیر ضروری ہے۔

○

۵
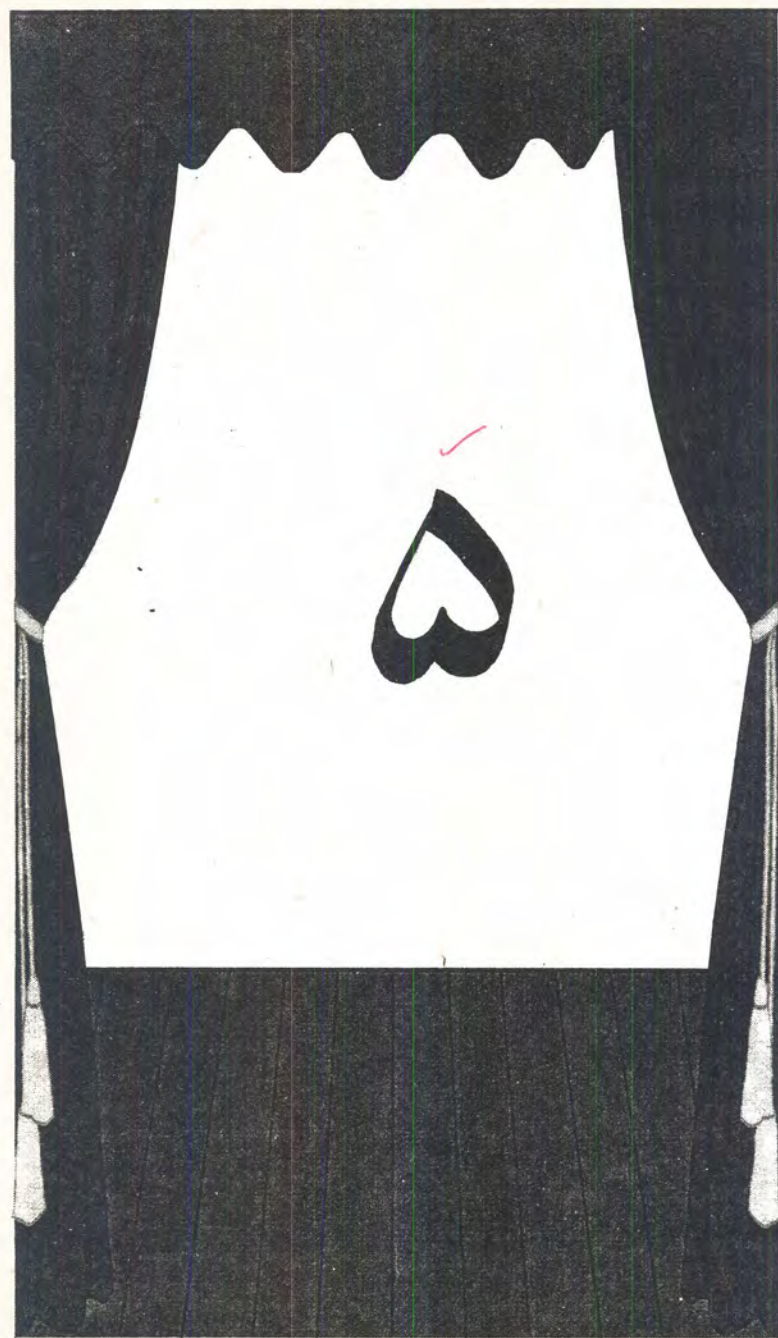
ریڈیو پاکستان لاہور نے ربیع الاوّل کے موقع کی مناسبت سے سیرۃ طیبہ پر ایک پروگرام ترتیب دیا جس کا عنوان تھا ''حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رحمت و شفقت''۔ اس پروگرام کی کمپیئرنگ محترم سراج منیر نے کی۔ صدارت عدلیہ کے ممتاز رکن سردار **محمد** اقبال موکل نے کی اور مقالہ جناب واصف علی واصفؒ نے پیش کیا، جس میں انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے اس اہم ترین پہلو پر نہایت وسعت نظری سے روشنی ڈالی۔ مقالہ کے آخر میں شرکاء نے اس موضوع پر ابھرنے والے اپنے سوالات بھی پوچھے جن کے جوابات واصف صاحبؒ نے اپنے معروف فنِ مکالمہ کے انداز میں دیئے۔

حضور نبی کریم ﷺ رحمت و شفقت

کمپیئر:۔ سراج منیر

سوالات کرنے والے:۔

نصراللہ غلزئی

محمد صدیق مغل

صدارت:۔ سردار محمد اقبال موکل

مقالہ نگار:۔ واصف علی واصف صاحب

سراج منیر:

حضور پاک ﷺ کی یاد قدیم و نئے مسکنوں کو روشن کر رہی ہے۔ میں اس زمانے کے صاحب کلام، کہ جن کے لفظ نبی رحمتؐ لقب کی نسبت سے روشن ہیں، جناب واصف علی واصف صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ تشریف لائیں اور نبی کریم ﷺ کی رحمت و شفقت کے ضمن میں اپنی گفتگو پیش فرمائیں۔

واصف علی واصف صاحب:۔

الحمد للہ ربّ العالمین والسّلام علیٰ سیّدالمرسلین و خاتم النبیّین۔

جناب صدرِ گرامی سردار محمد اقبال موکل صاحب! حاضرین و سامعین کرام! السلام علیکم۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا صد ہزار بار شکر ہے کہ اس نے ہمیں اپنے پیارے محبوب ﷺ کی امت میں سے پیدا فرمایا اور ہمیں دولت ایمان سے نوازا۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس ایک رسولؐ آیا ہے جو خود تم میں سے ہے اور تمہارا نقصان میں پڑنا اس

کے لیئے شاق ہے' تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے اور ایمان لانے والوں کے لیئے وہ شفیق اور رحیم ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا سند ہو سکتی ہے کہ حضور پاکؐ کی رحمت اور شفقت کا اعلان اللہ کریم نے خود فرمایا ہے۔ اللہ کا وہ احسان جس کی خواہش اور ضرورت تو انسان کے پاس ہو لیکن کوتاہی عمل کے سبب اس کا استحقاق اس کے پاس نہ ہو' رحمت کہلاتا ہے۔ رحمت اس بارش کی طرح ہے جو سوکھی اور پیاسی زمین کو سیراب کرتی ہے تاکہ مخلوق کے لئے غذا کا انتظام ہو سکے۔ بارش زمین کی ضرورت تو ہے لیکن زمین کا عمل نہیں۔ اسی طرح جب وجودِ انسانیّت کوتاہیَ عمل کی بدولت بیماریوں کا شکار ہوتا ہے' جسمانی بیماریاں' روحانی بیماریاں' اخلاقی اور سماجی بیماریاں -- ایسی بیماریاں جن کا علاج حکماء کے پاس نہیں ہوتا' نکتہ دانوں' دانشوروں' حکمرانوں اور فلسفہ دانوں کے پاس نہیں ہوتا' تو ایسے عالم میں انسان حسرت بھری نگاہ سے صرف آسمان کی طرف دیکھتا ہے' علاج کی ضرورت تو ہوتی ہے لیکن علاج بس میں نہیں ہوتا۔ پیاسی روحیں ایسی زمین کی طرح فریاد کرتی ہیں تو رحمتِ پروردگار جوش میں آتی ہے' بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور وجود انسانیّت کی تطہیر ہوتی ہے۔ محسنِ انسانیّت کے روپ میں احسانِ خداوندی ہوتا ہے۔ رحمت اور شفقت کے الفاظ' اللہ اور اللہ کے محبوب ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہوئے۔ اللہ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا کہ ان اللہ بالناس لرؤف الرحیم۔ رحمت کا مطلب ہے خطاؤں سے درگزر کرنا اور گناہوں کو معاف کرنا۔ رحمت کا حصول کسی استحقاق سے مشروط نہیں۔ اگر انسان کا اپنا عمل ذریعہ حصولِ رحمت ہوتا

تو آج علم والوں کو ضرور معلوم ہوتا کہ کسی انسان کو پیغمبر کیوں بنایا جاتا ہے' اس پر اتنی رحمت کس عمل کی وجہ سے ہوتی ہے کہ اسے جملہ عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا جائے۔ منصبِ رسالت اگر انسان کے اپنے کسب سے حاصل ہوتا تو یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا' لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ منصب اللہ کی رحمت سے ملتا ہے اور اللہ کی رحمت اپنے پیغمبرؐ کو' اپنے رحمتوں والے رسولؐ کو اس علاقے میں مبعوث فرماتی ہے جہاں اس کی زیادہ ضرورت ہو یعنی جہاں زیادہ بگاڑ ہو۔ پیغمبرؐ کا ورود اور وجود ہی باعثِ رحمت ہوتا ہے اور یہ رحمت انہیں حاصل ہوتی ہے جو زیادہ محروم ہوں۔ پیاسی زمین پر بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ یہ حیران کن بات ہے کہ اللہ نے اپنی رحمتوں کے نزول کے لئے اس معاشرے کو پسند فرمایا جس کے عمل میں حصولِ رحمت کا بظاہر کوئی استحقاق نہ تھا۔ وہ معاشرہ جو تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا' وہاں اللہ کی رحمت نے اپنے اس محبوب کو بھیجا جو رحمتہ للعالمینؐ ہیں اور جو رؤف اور رحیم ہیں۔ اللہ کی رحمت وہاں آئی جہاں زیادہ بگاڑ تھا۔ اللہ کی رحمت اس رحمت بھرے کلام کی شکل میں بھی آئی جو کلام پروردگار کی طرف سے موعظت ہے' دل کی بیماریوں کے لئے شفاء اور ایمان والوں کے لئے رحمت ہے اور اللہ کی رحمت اس انسانِ کامل کی ہستی میں عیاں ہوئی جسے بھیجنے والے نے مجسّمِ رحمت بنا کر بھیجا۔ آپؐ کا وجود مبارک ہی مجسّمِ رحمت ہے۔ آپؐ کے آنے سے صحرا میں بہاریں آ گئیں۔ گلزار ہستی کھل گیا۔ جمود میں حرکت پیدا ہو گئی۔ ساربانوں کو اکابرین بنا دیا گیا۔ دائمی سرگشتگیاں ختم ہو گئیں۔ وہ بستی' وہ شہر' وہ گلیاں' جہاں آپؐ نے قیام فرمایا' مقدس ہو

گئے۔ آپؐ کی شفقتوں نے تخریب میں نئی تہذیب پیدا کر دی۔ کردار میں انقلاب آ گیا۔ گناہگاروں کو شفاعت اور رحمت ملی۔ اندھیرے روشنی میں بدل گئے۔ منتشر، مجتمع ہو گئے۔ راہ گم کردہ لوگ نشان منزل بن گئے۔ رحمت کا بنیادی اور اہم تقاضہ یہ ہے کہ بگاڑ میں اصلاح پیدا ہو، مایوسیوں میں امید پیدا ہو، رحمت کا مطلب ہی یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے برے اعمال کی عبرت سے بچایا جائے۔ اللہ کے غضب سے اگر کوئی شے بچا سکتی ہے تو وہ رحمت ہے اور اللہ کی رحمت اس کے غضب سے وسیع تر ہے۔ اللہ کی رحمت کا نزول قرآن مجید اور رسول کریمؐ کی ذات میں موجود ہے۔ آپؐ کی ذات مجسّمِ رحمت ہے، آپؐ کا ہر انداز، اندازِ رحمت ہے، آپؐ رحمتوں کے رسول ہیں۔ آپؐ کے دم سے ہی انسان شر کے دامن سے نجات پا کے خیر کے دامن میں آ سکتا ہے۔ آپؐ کی رحمت تمام جہانوں کے لئے ہے۔ آپؐ کے تشریف لانے سے پہلے کیا حالات تھے اور بعد میں کیا حالات ہو گئے، یہ زمانہ جانتا ہے۔ آپؐ کا دامانِ رحمت ہمیشہ پھیلتا ہی رہا۔ آپؐ کے دم سے زمانہ بدل گیا بلکہ زمانے بدل گئے۔ آپؐ کی رحمت کسی ایک ملک، کسی ایک قوم یا کسی ایک نسل کے لئے نہیں بلکہ عالمین کے لئے ہے، زمین و آسمان کے لیئے ہے، ظاہر و باطن کے لئے ہے، ماضی و مستقبل کے لئے ہے، اپنوں کے لیئے ہے، بیگانوں کے لئے ہے، فرزانوں اور نادانوں کے لیئے ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ دنیا میں کوئی اور شخص اتنی رحمت اور شفقت لے کر نہیں آیا۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی پر وہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے جسے بعثت انبیاء کا سلسلہ کہتے ہیں۔ آپؐ کی رحمت بھی جملہ عالمین کے لیئے ہے اور آپؐ کی بعثت بھی جملہ عالمین

کے لئے ہے۔ آپؐ کے فیض سے کدورتیں محبت میں بدل گئیں۔ آپؐ نے خدا سے سارے زمانے کی بخشش مانگی، سب کے لئے رحم مانگا۔ آپؐ کے فیضِ نگاہ سے دل منور ہو گئے، دماغ روشن ہو گئے، مایوسیاں پرامید ہو گئیں، امیدیں یقینِ کامل میں بدل گئیں، یقین ایمان بن گیا اور ایمان ایک عالمگیر طاقت بن گیا۔ آپؐ کی رحمتیں اپنے بیگانے سب کے کاشانے پر تھیں۔ آپؐ کی شفقتیں رنگ و نسل سے بے نیاز ہر انسان کے لئے ہیں۔ آپؐ کی ذات ہی ہمارا سرمایہ ہے۔ آپؐ کی غلامی ہی ہماری عاقبت ہے۔ ہمارے لئے آپؐ کی سوانح مبارک، آپؐ کی سیرت طیبہ صرف تاریخی مطالعہ نہیں بلکہ ہمارے لئے تو حکم ہے۔ آپؐ کا عمل ہمارے لئے راہِ عمل ہے، راہِ نجات ہے۔ جب بھی ہمارے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوا، آپؐ ہی کے فیضِ نظر سے اصلاح ہوئی، آپؐ ہی کی بخشی ہوئی نورِ ایمان کی روشنی میں پاکستان بنا اور آپؐ ہی کے فیضِ نظر سے اس کا قیام و دوام ممکن ہے۔ آپؐ کے اخلاقِ عالیہ میں رحمت و شفقت سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ظلم اور ظالم کے مقابلے میں آپؐ کے پاس رحمت و شفقت تھی۔ آپؐ نے بگڑے ہوئے سرکش مزاجوں کو رحمت کا عملی پیغام عطا فرمایا۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپؐ نے کبھی غصہ نہیں فرمایا۔ آپؐ نے کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ کسی کو اپنے دامنِ رحمت سے دور نہیں کیا۔ ہر سائل کے لیے آپؐ کے پاس شفقتیں ہیں۔ آپؐ کے پاس ہر دل میں اترنے والی محبّت ہے۔ آپؐ کا قرب تقرّبِ الٰہی ہے۔ آپؐ سے دوری حقیقت سے دوری ہے۔ آپؐ کی شفقتوں اور رحمتوں نے وہ عظیم انقلاب پیدا کیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے من مانیاں کرنے والے رضائے

حق کے طالب ہو گئے۔ آقا اور غلام کی تقسیم ختم ہو گئی۔ آپؐ نے نیا نقطۂ نظر عطا فرمایا، نیا تخیّلِ حیات بخشا۔ آپؐ نے ظالموں کو بے ضرر بنا دیا اور بے ضرر کو منفعت بخش بنا دیا۔ نسل و نسب کی برتری ختم کر کے تقویٰ و توکّل کی برتری قائم کر دی۔ عرب و عجم کی تقسیم ختم ہو گئی۔ حبشی غلام کو اذیّت دینے والے اسی غلام کی آواز کو آوازۂ حق سمجھ کر مسرور ہو رہے تھے۔ آپؐ نے سرکشوں کو ادب سکھا کر سرفرازی کا رستہ دکھایا۔ اللہ کریم نے قرآن مجید میں جو لائحہ عمل ارشاد فرمایا، جو علم دیا، اس کے عین مطابق آپؐ کا عمل موجود رہا۔ آپؐ کی زندگی قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ آپؐ کو اس حد تک نوازا گیا کہ آپؐ کی بعثت سے قبل زندگی بھی مفہومِ قرآن کے عین مطابق ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب سے وسیع ہے۔ خالق کا غضب اپنی مخلوق کے لئے کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ وہ مخلوق کا صرف اس کے اعمال کے حوالے سے انصاف فرمائے۔ جلال عدالتِ کبریا کے سامنے کس کی مجال ہے کہ وہ اپنے کسی عمل یا کسی عبادت پر ناز کر سکے۔ اللہ انصاف کرنے پہ آ جائے تو غضب ہو جائے اور انسان کو عبرت کا سامنا ہو۔ اس کی رحمت اس کے غضب سے وسیع ہے اور رحمت کے وسیع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہے کہ رحمت اس کو اس کے اعمال کی عبرت سے بچائے۔ رسولِ رحمتؐ کا یہ اعجاز ہے کہ ایک پریشان حال معاشرے کو اس کی عبرت سے بچا کر اسے ایک امتیازی، اخلاقی، روحانی، اسلامی اور فلاحی معاشرہ بنا دیا۔ آپؐ کی رحمت نے کسی کو محروم اور مظلوم نہ رہنے دیا۔ آپؐ کی زندگی میں رحمت، شفقت اور درگزر کے اتنے واقعات ہیں کہ

تاریخ میں اس کی مثال ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کسی نیک دل انسان میں کبھی اتنا کمال نہ تھا' نہ ہے اور نہ ہو گا۔ آپؐ نے انسانوں کو اللہ کا رحم حاصل کرنے کے لیئے جو عملی راستہ دکھایا' اس کے بارے میں آپ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔ جو خدا کے بندوں کے لیئے رحمت رکھے اس کے لئے خدا کی رحمت ہے۔ مخلوق پر رحم کرنے والا ہی خالق سے رحم مانگ سکتا ہے"

حضور پاکؐ اللہ کے محبوبؐ ہیں اور اللہ کی مخلوق آپؐ کو محبوب ہے۔ آپؐ کی رحمت و شفقت ہر اس وجود کے لیئے ہے جو کائنات میں موجود ہے۔ آپؐ بچوں پر خاص طور پر شفقت فرماتے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جس دل میں خدا اولاد کی محبّت ڈالے اور وہ اس محبت کا حق ادا کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔ یہ شفقت مسلمان بچوں تک ہی محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں چند بچے بے ارادہ و بے علم مارے گئے۔ آپؐ کو اطلاع ملی تو بڑا رنج ہوا۔ کسی کی زبان سے نکلا کہ یا رسول اللہؐ وہ تو مشرکین کے بچے تھے۔ آپؐ نے فرمایا "مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں' خبردار! بچوں کو قتل نہ کرنا' خبردار! بچوں کو قتل نہ کرنا۔ ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے"۔ آپؐ اس حد تک شفیق تھے کہ اگر کوئی کسی جانور پر بھی ظلم کرتا تو آپؐ اسے منع فرماتے' جانوروں کو داغنے پر بھی آپؐ کی طبیعت پر گرانی گزرتی۔ ایک دفعہ کسی نے جھاڑی سے پرندے کے بچے اٹھا لئے تو آپؐ نے منع فرمایا اور ان بچوں کو واپس رکھنے کا حکم دیا کہ ان بچوں کی ماں پریشان تھی۔ آپؐ کی شفقت و رحمت کا یہ عالم ہے کہ آپؐ غصہ نہ فرماتے۔ آپؐ غصہ کرنے والوں کو منع

فرماتے' اللہ کے ارشاد کے مطابق کہ اللہ کے محبوبؐ وہی ہیں جو غصہ میں ضبط کرتے ہیں' لوگوں سے درگذر کرتے ہیں اور ان پر احسان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ابنِ عمرؓ نے آپؐ سے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ' وہ کون سی چیز ہے جو مجھے اللہ کے قہرو غضب سے بچا سکتی ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ غصہ میں نہ آیا کرو۔ انہوں نے پھر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ مجھے کوئی ایسا مختصر کام بتا دیجئے جس سے نیک انجام کی امید بندھ جائے۔ آپؐ نے فرمایا غصہ نہ کیا کرو۔ اور جتنی مرتبہ سوال کیا گیا' آپؐ نے ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ نیز فرمایا غصہ ایمان کو اس طرح برباد کر دیتا ہے جیسے سرکہ شہد کو برباد کرتا ہے۔ حضور پاکؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص پر غصہ پرقابو رکھتا ہے' اللہ اس پر رحم کرتا ہے اور عذاب سے پناہ میں رکھتا ہے' اس کی خطائیں بخش دیتا ہے' جو شخص زبان کو اپنے بس میں رکھتا ہے' حق تعالیٰ اس کی شرم و حیا کو محفوظ رکھتا ہے۔ ایک دفعہ جناب ابوذر غفاریؓ کا کسی شخص سے جھگڑا ہو گیا تو انہوں نے غصے میں آ کر کہا کہ اے وہ کہ تیری ماں کی رنگت سرخ ہے یعنی وہ لونڈی ہے۔ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ اے ابو ذر! میں نے سنا ہے کہ آج تو نے کسی کی ماں کا عیب نکالا ہے لیکن تجھے یاد رکھنا چاہئے کہ تجھے کسی سیاہ فام یا سرخ فام پر فضیلت حاصل نہیں' اگر افضل ہو سکتا ہے تو تیرا تقویٰ ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر جناب ابو ذرؓ اس شخص کے پاس گئے اور اس سے معافی مانگی۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضور پاکؐ کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ جناب صدیق اکبرؓ تھوڑی دیر سنتے رہے لیکن آخر جواب دینے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے بولتے ہی

حضور پاکؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا یا رسولؐ اللہ ! اب تک تو آپؐ خاموشی سے بیٹھے رہے لیکن جب میں بولنے لگا تو آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا اے ابوبکر! جب تک تم ضبط کر رہے تھے فرشتہ موجود تھا لیکن جب تم بولنے لگے تو شیطان آ پہنچا اور مجھے یہ پسند نہیں کہ میں شیطان کی قربت میں بیٹھوں۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک عمدہ وضاحت فرمائی۔ آپؐ نے فرمایا کہ انسان کی تخلیق تین طرح سے ہوتی ہے، وہ جنہیں دیر سے غصہ آتا ہے اور دیر سے خوش ہوتے ہیں، وہ جنہیں فوراً غصہ آتا ہے اور فوراً مان جاتے ہیں لیکن افضل وہ ہیں جنہیں دیر سے غصہ آتا ہے اور جلد راضی ہو جاتے ہیں۔ آپؐ کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے غارت گر اور دشمن قبائل کے خلاف جتنی مہمیں بھیجیں، ان کے سرداروں کو ہمیشہ یہ تاکید کی کہ کمزوروں کو ہرگز نہ ستایا جائے، بے ضرر لوگوں کو ہرگز تنگ نہ کیا جائے، خانہ نشینوں، دودھ پیتے بچوں اور بیماروں کو تکلیف نہ دی جائے۔ جو لوگ مقابلے میں آئیں، ان کے گھروں کو تباہ نہ کیا جائے۔ پھل دار درختوں کو برباد نہ کیا جائے، کھجور کے درختوں کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ آپؐ کی شفقت اور رحمت کا دامن اتنا وسیع ہے کہ دوست دشمن سب اس میں سما سکتے ہیں۔ آپؐ کے سفرِ طائف ہی کو لیں۔ اس کا مدّعا صرف یہ تھا کہ وہ لوگ راہِ ہدایت پہ آ جائیں۔ آپؐ بہبود اور نجات کا پیغام لے کر جاتے ہیں، وہاں کے سرکردہ حق ناشناس لوگ آپؐ سے ناروا سلوک کرتے ہیں، آپؐ کو سنگ باری کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی پیشانی مبارک کا خون بہہ بہہ کر پائے مبارک تک پہنچ گیا اور آپؐ نے ایک باغ میں

پناہ لی۔ اس دردناک حالت میں بھی آپؐ کی رحمت و شفقت نے آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑا، آپؐ میں تلخی و ناخوشگواری تک نہ آئی۔ آپؐ نے اس حالت میں یہ دعا فرمائی کہ الٰہی اپنی کمزوری و بے سروسامانی اور لوگوں میں ناقدری کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں، اے رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے، تو ہی درماندہ عاجزوں کا مالک ہے اور میرا مالک بھی تو ہے، مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے، بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جسے میرے معاملے پر قابو ہو، اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کسی مصیبت کی پرواہ نہیں کیونکہ تیری حفاظت اور عافیت میرے لئے بہت ہے، میں تیری ذات کے نور کی پناہ میں آتا ہوں جس سے تمام اندھیرے اجالے بن جاتے ہیں، دنیا اور آخرت کے تمام کام سنور جاتے ہیں، تیری ناراضگی اور غصہ مجھ پر نہ ہو، مجھے صرف تیری رضا اور خوشنودی درکار ہے، نیکی کرنے اور بدی سے محفوظ رہنے کی طاقت صرف تیری طرف سے ملتی ہے"۔ سچی محبت اور وسیع رحمت کی ایسی کوئی مثال چشمِ فلک نے نہ دیکھی ہوگی۔ حضور پاکؐ نے طائف کا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بیان فرماتے ہوئے کہا کہ میرے پاس پہاڑ کا فرشتہ آیا اور بولا کہ ارشاد ہو تو دونوں پہاڑوں کے پہلو ان پر الٹا دوں اور وہ پیسے جائیں مگر میں نے کہا کہ نہیں! نہیں! امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو ایک خدا کی عبادت کریں گے۔ یہ تھی حضور پاکؐ کی شانِ رحمت، یہ تھی آپؐ کی لازوال اور بے مثال شفقت، آپؐ کے صبرو استقامت کی حیرت انگیز مثال اور مخلوقِ خدا کے لئے محبت کے جذبات --- تاریخ عالم میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ گالی سن کر دعا دی گئی

ہو۔ پتھر پھینکنے والوں کو عبرتِ اعمال سے بچانے کا حوصلہ صرف رحمت اللعالمینؐ کی شان ہے۔ آپؐ کا بے پناہ اعتماد یہ تھا کہ انسان کتنا ہی گمراہ ہو' اس پر اصلاح کے دروازے بند نہیں ہوتے' انسان کتنا ہی زوال پذیر ہو جائے' اس کے لیئے رحمتِ حق کا امکان ختم نہیں ہوتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ان لوگوں کی نسلیں تو کجا' وہ لوگ خود ہی حضور پاکؐ کے دستِ شفقت پر ایمان لے آئے۔ واقعۂ طائف سیرتِ طیبہ کا ایک اہم موڑ تھا۔ آزمائش کی سخت ترین منزل پہ بھی آپ نے بد دعا نہ فرمائی۔ عالمِ انسانیّت میں اور کوئی برگزیدہ وجود شفقت اور رحمت کے اس بلند ترین مقام تک نہ پہنچ سکا۔ آپؐ معلّمِ اخلاق ہونے کی حیثیّت سے خود مظہرِ اخلاق بھی ہیں اور اخلاق کا بلند ترین مقام "رؤف و رحیم" آپؐ کا درجہ ہے۔ یہ آپؐ ہی کی شان ہے کہ زیادتی کرنے والوں کو معاف فرما دیتے۔ حضور پاکؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر آپؐ کی شانِ رحیمی نقطہ عروج پر تھی۔ وہ سردارانِ قریش جنھوں نے مسلمانوں کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی' جن کے ہاتھ معصوم مسلمانوں کے خون سے تر تھے' جن کے قلوب بغض اور عداوت کی آماجگاہ تھے' جو کسی سے کبھی درگزر نہ کرتے تھی' جنھوں نے ہجرت پر مجبور کیا تھا' مسلمانوں کو گھروں سے نکالا تھا' جن کے مظالم نے مسلمانوں پر زمین تنگ کر رکھی تھی' جو بیرون ملک بھی مسلمانوں کو تبلیغ سے روکتے تھے' جنھوں نے آپؐ کے جانثاروں کو سینکڑوں میل پیدل چلنے پر مجبور کر دیا' جنھیں اس وقت تک چین نہیں آتا تھا جب تک کہ مسلمانوں کے چین کو برباد نہ کرلیں --- آج وہی سردارانِ قریش حضور پاکؐ کے روبرو پیش کیئے

گئے۔ آپؐ نے فرمایا ! اے جماعتِ قریش ! آج خدا نے تمہاری جاہلانہ حسب و نسب کا غرور توڑ دیا' سب لوگ آدم کے فرزند ہیں اور آدم مٹی سے بنایا گیا' خدا کا ارشاد ہے کہ لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخوں اور قبیلوں میں اس لئے تقسیم کیا تاکہ تم پہچانے جاؤ' خدا کے ہاں تو اس کی زیادہ عزت ہے جس کے پاس تقویٰ زیادہ ہے --- پھر فرمایا کہ اے قریش ! اے اہلِ مکہ ! تمہارے خیال میں میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ سب نے کہا کہ آپؐ کریم ہیں اور کریم کی اولاد ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ تم آزاد ہو' آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں --- اللہ ! اللہ !! یہ سلوک ان لوگوں سے جن کی بد سلوکی کی داستان سے دل پارہ پارہ ہوتے ہیں۔ یہ حضور پاکؐ کی شانِ رحمت ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ آج کا دن ہی تو سلوک کرنے کا ہے۔ آپؐ نے سب تقصیریں معاف فرما دیں' سب کے لئے رحمت عام کر دی۔ یوں لگتا تھا جیسے مکہ ہی فتح نہیں ہوا بلکہ اہلِ مکہ کے قلوب کو خلقِ محمدیؐ نے فتح کر لیا ہے۔ فتح مکہ کے بعد مالِ غنیمت تو درکنار مہاجرین اسلام کو جو مکہ ہی سے پلٹ کر گئے تھے اور جن کے مکانوں پر کفّار قابض تھے ان کے مکانوں کی واپسی کا تقاضہ ہوا' تو آپؐ نے فرمایا کہ جن چیزوں کو تم خدا کے لئے چھوڑ چکے ہو' اب ان کی واپسی کا سوال کیوں کرتے ہو؟ حضور پاکؐ کی رحمتیں اور شفقتیں وسیع ہیں اور ان کا بیان بس کی بات نہیں ہے۔ رب العالمین کی رحمتیں' رحمت اللعالمینؐ کے پیکرِ محبوبی میں نمایاں ہیں۔ آپؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ صرف علم نہیں' یہ امر ہے' حکم ہے۔ آپؐ کی صفات سے اکتسابِ فیض تو جبھی کر سکتے ہیں جب ہم

ایک دوسرے کو معاف کرنا شروع کر دیں اور ہم درگزر کرنے والے بن جائیں، ہم انتقامی جذبات سے آزاد ہوں اور آپؐ کے ماننے والے آپؐ کے اعمال کی روشنی میں سفر کریں۔ حضور پاکؐ نے ایک راہ پر چل کر دکھایا ہے۔ رحمت کا راستہ، محبّت اور شفقت کا راستہ، معافی اور درگزر کا راستہ، نجات کا راستہ، برداشت کی بے پناہ قوّتوں کا راستہ، بد دعا نہ دینے کا راستہ، رضائے الٰہی کا راستہ بلکہ سیدھا راستہ! ہم اس راہ پر چل کر وحدتِ ملّت تک پہنچ سکتے ہیں۔ حضور پاکؐ کی سیرت ہی ہمارے لئے دین اور دنیا کی فلاح کا راستہ ہے۔ خدا ہمیں حضور پاکؐ کی محبّت عطا فرمائے اور اس محبّت میں ہم حضور پاکؐ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق حاصل کر سکیں۔ خدا ہمیں معاف کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین!

سراج منیر:

شاعرِ بارگاہِ رسالتؐ حضرت حسانؓ کا کیا ہی اچھا قول ہے کہ "ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف سے انؐ کے مرتبے کو بلند نہیں کرتے بلکہ انؐ کے ذکر سے اپنے کلام کے مرتبے کو بلند کرتے ہیں" ۔

سلفی شرارے سے روشن تھا یہ چراغ گفتگو

جناب واصف علی واصف صاحب یہ گفتگو فرما رہے تھے اور ان کی اس تفصیلی گفتگو سے ذہن میں بہت سے نکات پیدا ہوئے اور بہت سے سوالات در آئے جو انشاء اللہ تعالیٰ اس سٹوڈیو میں موجود حاضرین ان سے پوچھیں گے اور ان کے جواب سے اور بہت سے دریچے وا ہوں گے۔ جناب صدرِ محفل کی اجازت سے میں اب درخواست کروں گا مستفسرین

حضرات سے کہ وہ پہلے اپنا اسمِ گرامی بتائیں اور اس کے بعد سوال پیش کریں کہ ؎

بیٹھ جائیں سایہ احمدؐ میں منیرؔ
اور ان باتوں کو سوچیں جن کو ہونا ہے ابھی

محمد صدیق مغل :

میں جناب واصف علی واصف صاحب کو حضور اکرمؐ کی سیرت کے رحمت و شفقت کے پہلو پر فکر انگیز مقالہ پیش کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور جناب واصف علی واصف صاحب سے میری گذارش یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو رسولؐ اللہ کے سیرت کے اس پہلو کو زیادہ سے زیادہ اپنانا چاہئے تو گذارش یہ ہے کہ ہم اسے عملی طور پر کس طرح زیادہ سے زیادہ اپنا سکتے ہیں تاکہ سنت پر پوری طرح عمل در آمد ہو۔

واصف علی واصف صاحب

اس سوال کو اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ایک وضاحت اور ضروری ہو گی کہ ہم جو یہ سوال کر رہے ہیں، اور کتنے لوگ ہیں جو اس سوال کو حل کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں، قوم میں یا ملت میں یا امت کے حوالے سے رحمت اور شفقت عام ہو۔ جتنے لوگ فیصلہ کریں اتنے ہی لوگ ایسا کر سکتے ہیں۔ اس کا عملی طریقہ بہت آسان طریقہ ہے کہ انسان دوسروں کو معاف کرنا شروع کر دے، آپ اگر کسی کی غلطی برداشت کر سکتے ہیں اور اس وجہ سے درگذر کیا جائے کہ یہ سنتِ رسولؐ اللہ ہے تو پھر ہمارے ہاں ضروری بات ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہم ایک

دوسرے کے قریب آنے میں ممکن ہے کامیاب ہو جائیں بلکہ اس کے اندر اور بھی بہت سے واقعات ہیں اور بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کو گھیرنے میں لگ جاتا ہے اور ایک دوسرے کی گرفت کرنے لگ جاتا ہے اور اس طرح معافی کا باب جو ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

نصراللہ غلزئی :

میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنے مقالے میں بہت تفصیل کے ساتھ اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ نبی کریمؐ کی بعثت جو ہے وہ ایسی صورت میں رونما ہوئی جب چاروں طرف جنگ و جدل' جہالت اور اس قسم کے تمام خبائث جو معاشرتی زندگی میں ہو سکتے ہیں اور حضور پاکؐ کی آمد جو ہے اس نے وہاں انقلاب برپا کیا اور اس کی تفصیل آپ نے اپنے مقالے میں بیان فرمائی ہے۔ آج جب ہم دیکھتے ہیں تو سوائے اس ایک بات کے کہ ہم شاید تعلیمی اعتبار سے' پڑھنے لکھنے کے اعتبار سے ضرور اس دور سے آگے آ گئے ہیں لیکن معاشرتی خبائث کے اعتبار سے ہم شاید اس دور سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ فرمائیے کہ جس وقت اس دنیا میں ہدایت دینے والے کی گنجائش اس سے کہیں شدید تر ہے جب نبی کریمؐ اس دنیا میں تشریف لائے تو آج یہ جو خلاءانؐ کی عدم موجودگی کا ہے یہ ہم کیسے پر کریں تاکہ ہم اس انقلاب کو حاصل کر سکیں جو انہوں نے برپا کیا!

واصف علی واصف صاحب:۔

اس کا جواب میں پہلے پیش کر چکا ہوں کہ پیاس زمین کی ضرورت ہے، اس کا علاج نہیں۔ زمین کے عمل میں یہ چیز شامل نہیں ہے۔ ہم جس مقام پر معاشرتی طور پر جا چکے ہیں وہاں ہم سے عمل کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی ہے۔ اسؐ کی رحمت حاصل کرنے کا سوائے فریاد کرنے کے کوئی اور طریقہ نہیں ہے کہ ہم فریاد کریں اس کو پکاریں تا کہ وہؐ ہماری مدد فرمائیں اور ہمیں اپنی رحمت عطا فرمائیں اور وہ رحمتہ اللعالمینؐ ہیں جیسا کہ آپؐ کی رحمت ہر جہان کے لئے ہے بلکہ سب جہانوں کے لئے ہے تو ہم بھی اس جہان میں شامل ہیں اور ہم بھی اس طرف رجوع کریں اور آپؐ کی رحمتوں کو دعوت دیں اور ہم ایک دوسرے کے لئے رحمت بن جائیں تو پھر یہ چیز ہمیں حاصل ہو سکتی ہے۔

نصراللہ غلزئی :

جناب والا! میری گذارش یہ تھی کہ ایک معاشرے میں آج ہم اپنی کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ خباثت موجود ہیں اور آپ نے فرمایا کہ ہم اپیل کریں یا اللہ تعالیٰ سے اس کی مدد مانگیں۔ سوال یہ ہے کہ سوائے اس ایک طریقے کے کہ جو ایک آخری امید ہے اور جس کی طرف سے ہمیں اندازہ ہو رہا ہے، جو آپ فرما رہے ہیں اس کے علاوہ بھی کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ معاشرہ جو ہے وہ اصلاح پذیر ہو!

واصف علی واصف صاحب :۔

ہاں ! اس کی اور صورتیں ہو سکتی ہیں Administrative science کے ذریعے سے ہم اس کو ٹھیک کر سکتے ہیں اور دنیا میں اور بے شمار ایسے مضامین آ چکے ہیں جن کے ذریعے سے معاشرے کی اصلاح ہوا کرتی ہے' معاشی طور پر' اخلاقی طور پر اور جس وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا اسی وجہ کو ٹھیک کرنے سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اخلاق میں یا ایمان میں کچھ کمی آ گئی ہے تو اس کی وہ صورت ہم نے پیش کی تھی ورنہ کوئی معاشی انحطاط آ گیا ہے تو اس کی معاشی اصلاح ہونی چاہئے۔

نصراللہ غلزئی :

کیا آپ اس بات سے اتفاق نہیں کریں گے کہ اخلاق کا بگاڑ جو ہے وہ معاشرے کے بگاڑ کا باعث بنتا ہے اور اس کی بنیاد بنتا ہے!

واصف علی واصف صاحب:

آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں اس میں تھوڑا اور اضافہ کروں گا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ بگڑے ہوئے امیر لوگ' اور سنورے ہوئے امیر لوگ' اور بگڑا ہوا غریب اور سنورا ہوا غریب' ہمیں یہ خبر دیتا ہے۔ بگاڑ جو ہے یہ مزاج کا نام ہے' حال کا نام نہیں ہے اس کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ

بگڑنے کا سبب جو ہے وہ نہ پیسہ ہے' نہ پیسے کی کمی ہے' نہ حالات ہیں۔ بگڑنے والا بگڑتا رہتا ہے اور سنورنے پہ آ جائے تو اللہ کی رحمت

اس کو سنوار دیتی ہے۔ معاشیات بہت کچھ کرتی ہے لیکن سب کچھ نہیں کرتی اور ہم نے ایسے انسان دیکھے ہیں جو بگڑتے بھی رہتے ہیں اور سنورتے بھی رہتے ہیں۔

محمد صدیق مغل :

میں آپ سے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ سیرت کے اس پہلو کو جس میں آپ نے ہمیں یہ تلقین فرمائی ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے تو دشمن اور دشمنانِ اسلام کے لیئے اور ان کے شر سے محفوظ رہنے کے لیئے دعا تو کر سکتے ہیں۔ کیا ہمیں اس امر کی اجازت بھی ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کے ظلم و ستم سے تنگ آ جائے تو اس کے لئے بد دعا بھی کر سکے!

واصف علی واصف صاحب :۔

دشمن کی اصل قوّت جو ہے وہ دوست کی کمزوری ہے، دشمن اس وقت قوی ہوتا ہے جب دوست کم ہو جائیں، دوست کمزور ہو جائیں آپ دوستوں کی قوّت کی دعا کرو تو خود بخود دشمن کو کمزوری ہو جائے گی۔ بد دعا کرنا مزاج سے نکال دیا جائے۔ آپ کو بد دعا کرنے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوگی، تو بد دعا ہم اس لیئے کہہ رہے ہیں کہ راستے ٹھیک ہو جائیں، ہمیں کوئی کمزوری ہے جسے ہم بد دعا سے پورا کرنا چاہتے ہیں یا ہم بد دعا کے ذریعے اپنی وہ کمزوری دور کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی کمزوری کو دعا کے ذریعے پورا کرو۔ تو اس لیئے اگر بد دعا نہ کی جائے تو بہت بہتر ہے بلکہ بد دعا نہ ہی کی جائے۔

سراج منیر:

خوش نصیب ہے ملّتِ اسلامیہ کہ جس نے لوائے محمدیؐ کے نیچے پناہ پکڑی اور آج یہاں ہمارے اسٹوڈیو میں "خیر العباد ﷺ" کے عنوان کے تحت موضوع گفتگو تھا "نبی کریم ﷺ کی رحمت و شفقت" جو زمانوں پہ محیط اور زمینوں کے لئے جاری ہے اور اس ضمن میں جناب واصف علی واصف صاحب نے گفتگو فرمائی۔ والسلام

○

۶
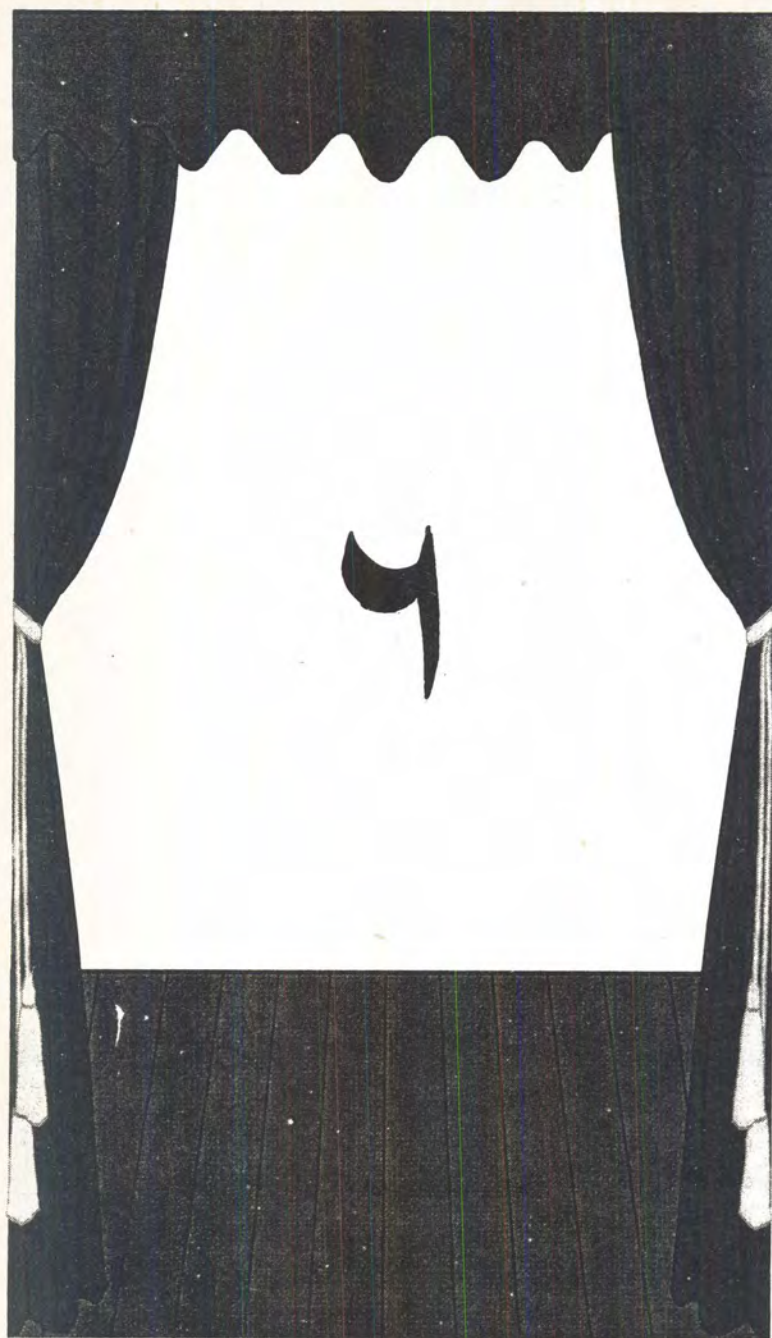
عراق نے کویت پر حملہ کیا تو عالمی دہشت والوں کو
مسلمانوں کے علاقوں میں فوجی مداخلت کا سنہری موقع مل گیا۔
ہر صاحبِ درد اور صاحبِ فکر مسلمان نے عراق کے کویت پر
حملے کی مذّمت تو کی مگر اغیار کے اجتماع کو مسلم امّت کے لئے
سخت نقصان دہ سمجھا۔ روزنامہ پاکستان کے ادبی صفحہ کے لئے
ڈاکٹر اجمل نیازی نے ایک سروے مکمل کیا جس میں مختلف
اہلِ قلم کی آراء کو قلم بند کیا گیا۔ انہی صاحب الرائے اشخاص
کی آراء کے ساتھ قبلہ واصف صاحبؒ کے خیالات بھی پیش
کئے گئے جو آپ کے لئے حاضر ہیں۔

خلیج کی جنگ کے حوالے سے اہلِ قلم کے خیالات

پاکستان کے عوام اور اہلِ قلم بالعموم عالمی اور اسلامی معاملات میں ایک مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے حوالے سے اتنی نظمیں مجھے موصول ہوئی ہیں کہ پوری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ میں جب امریکہ اور عراق کی جنگ کے حوالے سے اہلِ قلم کی رائے لینے نکلا تو مجھے ایک جیسی آوازیں سنائی دیں۔

میں نے مختلف اہلِ قلم سے گفتگو کی ہے جسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ کچھ تاثرات شعروں کی شکل میں بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی رائے سے اختلاف بھی سامنے آیا ہے۔ اس طرح ایک دائرہ بنا ہے جو پھیلتا جا رہا ہے۔ دائرہ جیسا بھی ہو' مرکزی نقطے کا مقام دلوں سے اوجھل نہ ہو تو تاریخ دشمنی نہیں کرتی۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی)

پروفیسر محمد منّور:

بہت شور مچایا جارہا ہے کہ ایران عراق جنگ میں کویت اور سعودی عرب نے صدام کی مدد کی تھی۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ عراق نہ ہوتا تو ایران کے مقابلے میں سعودی عرب اور کویت کا کیا حال ہوتا۔ جبکہ ایرانی انقلاب کے روحانی رہنما نے اعلان کیا تھا کہ ہم انقلاب برآمد کریں گے۔ چنانچہ کویت اور سعودی عرب پہلا نشانہ تھے۔ صدام نے نہ

صرف عراق کی جنگ لڑی بلکہ اس نے کویت اور سعودی عرب کی بھی جنگ لڑی ہے۔ یہ بات سراسر زیادتی ہے کہ صدام نے نمک حرامی کی ہے۔ صدام تب سعودی عرب اور کویت کے لئے ڈھال بن گیا تھا' اب امریکہ اور اس کے اتحادی ملکوں کے مقابلے میں بھی یہی حال ہے' عالمِ عرب اور عالمِ اسلام سمجھے نہ سمجھے' عراق اب بھی ایک ڈھال ہے۔ نو آبادیاتی تسلّط کے خلاف سب سے مضبوط مورچہ عراق ہے۔

احمد ندیم قاسمی:

خلیجی جنگ کا پس منظر کچھ بھی ہو' موجودہ صورت حال میں یہ جنگ ایک بڑی اندھی طاقت اور ایک حوصلہ مند مسلم ملک کے درمیان ہے اور دنیا کے ہر با ضمیر اور دیانت دار انسان کی پوری ہمدردیاں غیر مشروط طور پر عراق کے ساتھ ہیں۔ عراق نے اس دور میں جرات و حوصلہ مندی کی ایک مثال قائم کر دی اور ایک سپر طاقت کا مقابلہ کر کے ہر شخص اور ہر ملک پر واضح کر دیا ہے کہ بڑے سے بڑے آمر اور عظیم سے عظیم طاقت کے ساتھ بھی کامیابی سے پنجہ آزمائی ہو سکتی ہے۔

ظہیر کاشمیری:

خلیج کی جنگ سے جو نتائج پیدا ہوں گے وہ اسلامی دنیا کی نشاۃ ثانیہ کے لئے زہرِ قاتل کا حکم رکھتے ہیں۔ پاکستان کی حکومت کا یہ فرض تھا کہ وہ اسلامی ملکوں کے تنازعے میں خود کو غیر جانب دار رکھتے ہوئے امتِ مسلمہ کے فورموں اور پلیٹ فارموں کے ذریعے کوئی حل تلاش کرتی۔ خلیج میں امریکیوں اور اس کے اتحادیوں کا اجتماع صرف مسلمان ممالک

کے لئے ہی تباہی کا باعث نہیں بنے گا بلکہ تیسری دنیا کے تمام ممالک پر بھی منفی اثرات پڑیں گے' اس سے عالمی جنگ کے امکانات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ امریکہ حسبِ ضرورت عراق پر ایٹم بم گرانے سے گریز نہیں کرے گا۔

سید اسعد گیلانی:

کویت اور عراق کا مسئلہ دو مسلمانوں کی عالمی تنظیم یا عرب لیگ کی معرفت حل کیا جاسکتا تھا۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی مداخلت ناقابل برداشت ہے۔ ہم اسرائیل کو طاقتور بنانے کے عزائم کی مذمت کرتے ہیں اور عالمِ اسلام کو متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

اشفاق احمد:

اس جنگ میں جو مسلمان پر گزر رہی ہے' دل اس پر خون کے آنسو روتا ہے۔ بڑی اور سامراجی قوتیں تیل کے حصول یا کسی بے معنی اصول کا ڈھونگ رچا کر برتری حاصل کرنا چاہتی ہیں' وہ اصل میں مسلمانوں کی طاقت کو زائل کرنا چاہتی ہیں۔ امریکہ ان تمام مسلمانوں سے خوش ہو گا' جو کاسینو میں جوا کھیلیں' پیرس کے گلی کوچوں میں دادِ عشرت دیں' بادہ نوشی سے دل بہلائیں' نئی نئی شادیاں کریں' لیکن جو پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے' صدر بش ایسے مسلمان ملک' ایسے مسلمان لیڈر مسلمان حکمران کو کبھی برداشت نہیں کرے گا۔ صدام لوگوں کا محبوب ہوا ہے' وہ سچ مچ کا بہادر ہے' لوگ فلموں میں مصطفیٰ قریشی کی بہادری کی اداکاری سے متاثر ہو جاتے ہیں' جب تک مسلمانوں کی اپنی یو این او نہ

ہوگی، عالمی غنڈہ گردی سے بچنا مشکل ہے۔

وحیدہ واحد:

میں صدق دل سے یہ سمجھتی ہوں کہ صدام حسین غلطی پر ہے، عالم اسلام پر جو مصیبت آ پڑی ہے، وہ اسی شخص کی لائی ہوئی ہے۔ امریکہ کو بہانہ اسی نے دیا ہے۔ تاریخ صدام کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔

پرتو روہیلہ:

شاعر اور تخلیق کار ہونے کے ناطے ہر جنگ کی مذمت کرتا ہوں، لیکن ایک مسلمان ترقی پذیر ملک کے مسلمان باشندے کی حیثیّت سے خلیجی جنگ کی انتہائی مذمت کرتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب جب کہ امریکی عزائم کی راہ سے کمیونزم کا روڑا ہٹ گیا ہے ان کی ساری توجہ اسلام اور اسلام کے نام لیواؤں کو ملیامیٹ کرنے پر مرتکز ہے۔

اسلم کمال:

قافلہ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہیں تابدار ابھی دجلہ و فرات

اس شعر کے اندر علامہ اقبال کی حسرت صدام حسین کے روپ میں تڑپتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ دجلہ و فرات کے کنارے ایک نئی تاریخ خونِ مسلم سے لکھی جارہی ہے۔ عالمِ اسلام میں صدام اکیلا سربکف ہے۔ مجھے یہاں علامہ اقبال کا یہ مصرعہ یاد آرہا ہے۔

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے

میں جنگ ہی کے خلاف ہوں' وجہ یہ ہے کہ موجودہ ہتھیاروں کے مہلک اثرات سے لوگ واقف نہیں' ان کے مابعد اثرات ماحولیات پر اتنے بھیانک ہوتے ہیں کہ کوئی پاگل ہی جنگ کی حمایت کرسکتا ہے' لیکن جب ایک مقام پر کوئی واقعہ ہوا ہو تو اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ امریکہ نے جن اصولوں کو بنیاد بنا کر عراق پر حملہ کیا ہے' مختلف مقامات پر ان اصولوں کی مسلسل پامالی امریکہ کے ہاتھوں ہی سے ہوئی ہے۔ امریکہ کے خلاف دنیا بھر کے مظلوم لوگوں کا رد عمل غیر فطری نہیں۔

انور سدید:

انسان اور انسانیت کو تحفظ پہنچانے والے' مستقبل کو روشن اور دنیا کو حسین بنانے والے مہذب لوگ' ترقی یافتہ حکمران اس دنیا کی تباہی کے درپے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا سیاست میں بم کو استعمال کر رہی ہے۔ ادیب ظلم کا مخالف ہے' معصوم کا طرف دار ہے' بے گناہ کا حمایتی ہے۔ یہ کسی دھڑے کا معاون نہیں۔ ایک پاکستانی قلم کار اور ادیب کی حیثیت سے میرا مطالبہ یہ ہے کہ خلیج کی جنگ فوراً بند کی جائے' معصوم اور بے گناہ لوگوں کی زندگی کو تحفظ دیا جائے۔

طفیل ہوشیار پوری:

خلیج کی جنگ نے پوری امتِ مسلمہ کو پریشان کر رکھا ہے۔ مسلم سر زمین پر ہونے والی اس جنگ کو جس قدر جلد روکا جا سکے روکنا چاہیے۔

مظہر الاسلام :

جنگ کہیں بھی ہو ..... جنگ ہے۔ ہم لکھنے والے جنگ کی نہیں امن کی باتیں کرتے ہیں اور ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے قلم کو امن کے لئے وقف کر دیں۔

ڈاکٹر شہباز ملک :

اگر صدام حسین نے کویت پر غاصبانہ قبضہ کر کے ایک غلط کام کیا تو پھر امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر حملہ کر کے اس سے بھی بڑا غلط اقدام کیا ہے۔ یہ ایک جرم ہے۔ اس ضمن میں سلامتی کونسل کی قرار داد کا سہارا لیا گیا ہے' جب کہ قبل ازیں فلسطین و کشمیر کے سلسلے میں اس سلامتی کونسل کی قرار دادیں سرد خانے میں پڑی ہیں۔

علی اکبر عباس :

خلیج کی جنگ ایک یہودی جال ہے جس میں امتِ مسلمہ کو پھانس لیا گیا ہے۔ اس سے عربوں کی دولت اور مسلم امہّ کی فوجی قوّت کو ختم کرنے کا منصوبہ بخوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ اس سے نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے کہ سارے کبوتر مل کر جال لے اڑیں۔

محمد ہمایوں :

خلیج میں مسلمانوں کی جو خون ریزی ہو رہی ہے وہ افسوسناک ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کو امن بحال کرنے کی کوششیں تیز تر کرنا چاہئیں۔ وزیر اعظم پاکستان نواز شریف نے امن مشن میں قابلِ تعریف کردار ادا کیا ہے۔

افضل توصیف :

عراق کی طاقت ٹوٹنے کے ساتھ ہی امریکہ کا مسلم دنیا کی واحد دولت تیل کے سمندروں پر مکمل کنٹرول ہو جائے گا۔ اب تو یہاں روس کی رقابت بھی نہیں ہے' امریکی اور یہودی تسلط بیت المقدس سے آگے تہذیب و تقدس کے اسلامی مراکز تک پھیل جائے گا۔ یہ بات یقینی ہے کہ امریکی بیڑے اب خلیج میں مستقل رہیں گے اور سعودی عرب امریکی لشکر کی پکی چھاؤنی بن جائے گا۔ شرم کی بات صرف اتنی ہے کہ حرم کی حفاظت ۹۲ کروڑ مسلمانوں سے نہ ہو سکی۔ امریکی لشکر جن کے کل کمانڈر اور جرنیل یہودی ہیں جو آج سعودی عرب کی زمین پر چھاؤنی ڈالے پڑے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے حرم شریف کو خطرہ کس سے ہے امریکہ اور اسرائیل سے یا عراق جیسے ملک سے جو عرب بھی ہے اور مسلمان بھی۔ حفاظت کی بات ہے تو بغداد شہروہ شہر ہے کہ جہاں ۸۱ انبیاء کرامؑ کے مرقد ہیں' کتنے ہی صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہؒ یہاں دفن ہیں۔ شرم کی بات ہے کہ بصرہ اور بغداد جیسے شہروں پر اب تک ۳۶ ہزار ہوائی حملے ہو چکے ہیں۔ ان بستیوں میں کس کے گھر جل رہے ہیں؟ ان بستیوں پر آگ برسانے کا تعلق کویت سے کس طرح بنتا ہے؟ فکر کی بات تو یہ بھی ہے کہ سعودی عرب امریکی لشکر کے کنٹرول میں ہے۔ کیا آئندہ مسلمانوں کو حج کا ویزا امریکی کمانڈر دیا کرے گا؟

حسین شاد:

جنگ تیز ہونی چاہئے تاکہ یہ جلد ختم ہو۔ اب یہ اضطراب دیکھا

نہیں جاتا۔ یہاں مصالحانہ جنگ بندی کے بعد بین الاقوامی غنڈے کہیں اور اپنی کاروائی شروع کریں گے۔ ہر طرح کی عالمی غنڈہ گردی کو لوگ مل کر ختم کریں۔

توفیق بٹ:

میں نے ہمیشہ یہ خواہش کی ہے کہ امن رہے۔ کبھی کبھی امن کے لئے جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے۔ عالمِ اسلام کا غلبہ ہر مسلمان کی خواہش ہے۔

افضل عاجز:

اولیائے کرامؒ کے مزاروں پر بمباری کی کون شخص مذمت نہیں کرے گا۔ گیارہویں شریف پر نیاز دینے والے خون کا نذرانہ کب دیں گے!

نثار اکبر آبادی:

ہے دیکھنا تو جنگ کا میدان دیکھنا
تنکے نے روک رکھا ہے طوفان دیکھنا

نرگس شیخ:

فضا سے آگ برستی ہے جنگ جاری ہے
صفِ یہود و نصاریٰ پہ خوف طاری ہے

واصف علی واصف صاحب:

ایک معمولی وجہ سے ایک غیر معمولی جنگ نہیں ہو سکتی۔ اس کے پیچھے کوئی راز ہے' گہرا راز ہے۔ یہ وجہ اور نتیجے کی بات نہیں' یہ

انسان اور مقدّر کی بات ہے' مسلمان اور اس کے یقین کی بات ہے۔ اسلام اور اس کے مستقبل کی بات ہے' ایک آدمی جس یقین اور اعتماد سے ڈٹا ہوا ہے' یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ ۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

میری نگاہ میں اس گردو غبار سے کوئی شہسوار نمودار ہوگا' اگر روحانی دنیا پر غور کیا جائے تو اس وقت جنگ حضرت علیؓ اور غوث پاکؒ کے گھر میں ہو رہی ہے' جن کو ہم مدد کے لئے پکارتے ہیں' بات تو ان کے گھر تک پہنچ چکی ہے' ہمیں انتظار کرنا چاہئے' مسلمان اپنے آپ کو دریافت کریں گے۔

انسان اور مقدّر کی بات ہے، مسلمان اور اس کے یقین کی بات ہے۔ اسلام اور اس کے مستقبل کی بات ہے، ایک آدمی جس یقین اور اعتماد سے ڈٹا ہوا ہے، یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ ۔

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

میری نگاہ میں اس گردو غبار سے کوئی شہسوار نمودار ہوگا، اگر روحانی دنیا پر غور کیا جائے تو اس وقت جنگ حضرت علیؓ اور غوث پاکؒ کے گھر میں ہو رہی ہے، جن کو ہم مدد کے لئے پکارتے ہیں، بات تو ان کے گھر تک پہنچ چکی ہے، ہمیں انتظار کرنا چاہئے، مسلمان اپنے آپ کو دریافت کریں گے۔

○

اُردُو ادب میں حمد

ڈاکٹر سہیل احمد خان:

آج "منشورہ" میں موضوع گفتگو ہے "اردو شاعری میں حمد"۔ شاعری اور حمد کا تعلّق بہت قدیم ہے۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں میں شاعری کا رشتہ اور شاعری کی جڑیں مذہبی تجربے کے اندر بہت گہری رہی ہیں اور مختلف تہذیبوں نے حمدیہ شاعری کا اپنا اپنا تصوّر پیش کیا ہے۔ اسلامی تہذیب نے جو فنی سانچے تشکیل دیے ہیں اس میں کچھ بنیادی شعری سانچے ہیں، بنیادی شعری علامات بھی ہیں جو ہماری فارسی، عربی، ترکی اور اردو شاعری کے ساتھ ساتھ ہماری علاقائی شاعری میں بھی نمایاں اور اجاگر نظر آتی ہے۔ آج اردو شاعری میں حمد کے موضوع پر پہلے پروفیسر جیلانی کامران صاحب ایک مضمون پڑھیں گے اور اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو کریں گے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اور ہمارے صوفی دانشور جنابِ واصف علی واصف صاحبؒ۔ تو میں پہلے جیلانی کامران صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنا مضمون اس موضوع پر پڑھیں تاکہ اس موضوع کے بنیادی خطوط کی وضاحت ہو سکے۔

پروفیسر جیلانی کامران:

ہماری علمی اور ادبی روایت کا دستور رہا ہے کہ اللہ کے اسم کے ساتھ ہر کام کی ابتداء کی جاتی ہے۔ ہمارے تمدن میں یہ دستور برابر موجود ہے اور اس کے بارے میں ایمان ہے کہ جس کام کو اللہ کے نام سے شروع کیا جاتا ہے وہ بار آور ہوتا ہے اور اس کام کے دوران انسان خیر و برکت سے بھی مستفید ہوتا ہے۔ اس ایمانی نقطہ نظر نے ہماری علمی و ادبی روایت کو ایک خاص اسلوب اور ایک خاص طریقہ کار فراہم کیا ہے۔ مسلمانوں کی نگارشات کی ایک نمایاں خصوصیّت رہی ہے کہ موضوع پر لکھنے سے قبل حمد ضرور تحریر کی جاتی تھی۔ حمد کے بعد نعت اور پھر درجہ بدرجہ بزرگان دین کی مدح لکھنے کے بعد شاعر اپنی شاعری کی طرف رجوع کرتا تھا اور داستان گو اپنے قصے کہانیوں کی دنیا میں وارد ہوتا تھا۔ عصرِ حاضر کے اسالیب نگارش کے لیئے حمد اور اس مرتبے کی جملہ نگارشات اصل موضوع سے غالباً" کسی قسم کا تعلق رکھتی دکھائی نہیں دیتی لیکن مسلمانوں کے تہذیبی رویوں میں ان کا مقام ہمیشہ بنیادی رہا ہے اور مسلمانوں کا ادب اور علم اس بڑے پس منظر سے اپنا تمدنی شعور حاصل کرتا رہا۔ حمد کے بغیر مسلمانوں کے ادب کی پہچان ناممکن رہی ہے۔ ادبی روایت میں حمد کے ساتھ ابتدائے تحریر یقیناً ہوتی ہے اور کوئی سی بھی قدیم کتاب اس افتتاحیہ کے بغیر مکمل قرار نہیں دی جا سکتی اور ہر بڑے اہل علم، ادیب اور شاعر نے حمد لکھی ہے خواہ حمد کتاب کے آغاز میں شامل ہے یا اسے شاعری اور نثر میں جداگانہ اور منفرد مقام دیا گیا ہے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کی "کشف المحجوب" کا آغاز بھی حمد سے ہوتا ہے، امیر خسروؒ کے دیوان بھی حمد سے شروع ہوتے ہیں اور پرانے نصابِ تعلیم کی مشہور کتاب "کریما" حمد کے ان اشعار کے ساتھ بخوبی نشان دہی کرتی ہے کہ ؎

کریما بہ بخشا بر حال ما
کہ ہستم اسیرِ کمند ہوا
ندارم غیر از تو فریاد رس
تو ہی عاصیاں را خطا بخش و بس

"کشف المحجوب" کی حمد اس طرح ہے کہ "تمام تر مدح اس کے وجہہ منیر کو ہے کہ جس نے اپنے مقربین خاص پر عالمِ ملکوتی کے امور روشن فرمائے اور اپنی صاف باطن ہستیوں پر عالمِ جبروت کے راز کھولے۔ وہی ذاتِ مقدس مردہ دلوں کو اپنے کبریائی نور سے زندہ کرنے والی ہے اور وہی ان زندوں کو اپنے عرفان کی حیات ابدی عطا فرمانے والی ہے اور اپنے اسمائے ذات کے اسرار ان پر وارد کرنے والی ہے ------ "توتا کہانی" کی حمد کا رنگ اپنا ہے " احسان اس خدا کا کہ جس نے دریائے سخن کو اپنے ابر کرم سے گوہر معانی بخشا اور زبان کو واسطے حمد کے گویا کیا۔

سبھوں کا وہی دین و ایمان ہے
یہ ہیں دل تمام اور وہی جان ہے
ترو تازہ ہے اس سے گلزار خلق
وہ ابر کرم ہے ہوا دار خلق

کسی سے نہ بر آوے کچھ کام و جاں

جو وہ مہر بان ہو تو کل مہر بان

قدیم حمد کا ایک رنگ یہ بھی قابلِ غور ہے جو عموماً داستانوں اور رموزِ عشق پر مبنی کتابوں کا سر آغاز بنتا ہے ۔

زباں پر ہمیشہ ہو حمد خدا
نہ ہو دل میں الفت جہاں کی ذرا
پہل عشق میں ذاتِ حق نے ہی کی
بنے اس کے محبوب میرے نبیؐ
فقیروں سے رتبہ بڑا عشق کا
نہ ہوتا اگر یہ تو ہوتا خدا
خدا علم سے کب کسی کو ملا
ملا عشق جب دل میں پیدا ہوا
محبت کی طے جب کہ منزل نہ ہو
کسی کو بھی کچھ جگ میں حاصل نہ ہو
بسر عشق میں جن کی ہوتی رہی
سدا ان پہ رحمت خدا کی رہی

حمد ادبی روایات کے دوران مناجات اور دعا کا اظہار بھی کرتی رہی ہے اور اس اعتبار سے اس کی متعدد صورتیں ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ دیوانِ غالب کی پہلی غزل نقشِ فریادی بھی حمد ہے اور اقبال کی "ہے یہی میری نماز' ہے یہی میرا وضو" بھی حمدیہ جذبات کی نشان دہی کرتی ہے۔ عصرِ

حاضر میں حمد کو شاعری میں باقاعدہ طور پر مقام دیا گیا ہے اور حمد کی ایسی صورتیں بھی ظاہر ہوئی ہیں جو مروجہ طرزِ اظہار کی پیروی نہیں کرتیں۔ حافظ لدھیانوی نے حمد لکھی ہے اور روایت کی باقاعدہ پاسداری کی ہے۔ ان کی حمد کا رنگ یہ ہے۔

حرفِ کُن سے جہاں کیا پیدا
نیست کو ایک پل میں ہست کیا
کائنات آئینہ ہے حیرت کا
یہ کرشمہ ہے تیری قدرت کا
حمد کے ہیں ہزار ہا عنوان
حافظ بے ہنر سے کیا ہو بیاں
عشق خیر البشرؐ عطا کر دے
دامن دل کو نور سے بھر دے

اس ضمن میں حفیظ تائب کی حمد بھی قابل غور ہے۔

کس کا نظام رہنما ہے افق افق
کس کا دوام گونج رہا ہے افق افق
کس کے لیے سرود و صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے نمود ضیا ہے افق افق
کس کی طلب میں اہل محبت ہیں داغدار
کس کی ادا سے حشر بپا ہے افق افق

حمد کا تذکرہ بے حد تفصیل طلب ہے تاہم حمد کے ضمن میں بعض

باتوں کا ذکر کرنا مناسب نظر آتا ہے حمد اصولی طور پر ذاتِ باری تعالیٰ کی تسبیح کا نام ہے اور اس اعتبار سے خالقِ ارض و سما اور شاعر کا مخلوق ہونے کی حیثیت سے ایک واضح رشتہ قائم ہوتا ہے۔ شاعر سے کوئی بھی تخلیقی فنکار مراد لیا جاسکتا ہے۔ حمد اظہارِ بندگی ہے اور بندہ و مخلوق ہونے کی نسبت سے حمد کا بنیادی مفہوم ظاہر ہوتا ہے۔ حمد کی ایسی صورت اسمائے الٰہی اور احسانات خداوندی کی نشان دہی کرتی اور یوں ذاتِ حق کو ادبی روایات میں شہودی نظریے کے مطابق شامل کرتی ہے۔ منا جات کے آداب کو حمد میں شامل کرتے ہوئے جہاں تعریف ایزدی کا اظہار ہوتا ہے وہیں بندہ اپنی عاجزی کا بھی بیان کرتا ہے اور اس طرح حمد میں دعا اور طلب کے عناصر بھی شامل ہوجاتے ہیں۔ یوں حمد بیک وقت مناجات بھی بنتی ہے اور دعا بھی۔ اس طرح بندہ اپنے خالق سے مانگنے کی جسارت بھی کرتا ہے۔ ادبی روایات میں حمد کی جن صورتوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے' ان میں ایمان اور عقیدے کی کیفیات بخوبی دکھائی دیتی ہیں اور متعدّد راہوں اور رابطوں سے ذاتِ حق کے ساتھ بندے کے رشتے کی نشان دہی کا علم بھی ہوتا ہے۔ تاہم ادبی روایت کے طریقِ کار کو دیکھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ حمد جو ہے وہ نگارشات کو روایتی طور پر مقام آغاز ہی فراہم کرتی ہے اور عقیدے اور ایمان کی توثیق کرتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حمد کا تعلّق محض نگارشات کی ابتدا ہی سے ہے اور کیا اس تعلّق کو نگارشات میں تلاش نہیں کیا جاسکتا مثلاً نعتوں اور مذہبی شاعری کے مجموعوں میں حمد کا رشتہ ایمان اور عقیدتوں کی نسبتوں سے قائم کیا جاسکتا ہے لیکن "گل بکاؤلی" "توتا کہانی" یا "سکینہ۔

الاولیاء" کے ساتھ حمد کو کیسے مربوط کیا جاسکتا ہے۔ قدیم کتابوں میں جن میں امام غزالیؒ کی " احیاء العلوم" بھی شامل ہے' ان کے نفسِ مضمون کو حمد کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں علم کی ہر کتاب اور ادب کو علم میں شامل کیا جاتا تھا' وہ سب حمد کے ساتھ شروع کی جاتی تھیں۔ اس لیے پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا حمد کی حیثیت محض روایت کی تھی یا اس کا کوئی گہرا مفہوم تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب حمد کو ادبی یا علمی نگارش میں شامل کیا جاتا ہے تو حمد مکتوبی الفاظ کی وجہ سے ذاتِ حق کے موجود ہونے کی گواہی مرتب کرتی ہے' حمد شہادت فراہم کرتی ہے اور لکھنے والا ذاتِ حق کے انا الموجود کو تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح وہ جو کچھ لکھتا ہے' خدا کے حضور میں لکھتا ہے اور ذات کی موجودگی میں لکھتا ہے اور اس کا ہر لفظ ذمہ دار تحریر کا مقام پاتا ہے۔ ایسے گہرے احساسِ الوہیت نے حمد کے ذریعے مسلمانوں کے ادب اور علم کو عبادت کا مقام دیا تھا' قلم کو وہی لکھنا سکھاتا ہے اور وہی پڑھنے اور لفظ کو پہچاننے کی صلاحیّت بخشتا ہے۔ حمد اس احسانِ عظیم کا اعتراف ہے اور روایت کے طویل سلسلے میں حمد کی موجودگی جہاں شہودِ حق کا ثبوت فراہم کرتی ہے وہیں لکھنے والے کو ہر قدم پر غافل ہونے سے بچاتی ہے۔ تو حمد محض روایت نہیں ہے' ایک واردات ہے جس کا تخلیقی عمل کے ساتھ گہرا تعلّق ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خاں:

شکریہ جیلانی کامران صاحب۔ آپ نے اپنی اس تحریر میں بہت

خوبصورت جائزہ لیا' نہ صرف اردو شاعری میں بلکہ اردو کی داستانوں اور اردو ادب میں ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب میں حمدیہ شاعری کی جو مختلف شکلیں رہی ہیں' ان کا بھی بخوبی جائزہ لیا۔ اب میں اس موضوع پر گفتگو کے لیے واصف علی واصف صاحبؒ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس مذہبی تجربے' اس واردات کی جو بحث ہے' ہمارے پاس تو لفظوں کی گرفت میں آ ہی نہیں سکتی اور وہ تجربہ لفظوں میں سما ہی نہیں سکتا' تو یہ مشکل جو ہے یہ کیسے حل ہو؟

جناب واصف علی واصف صاحب:

"حمد" کا لفظ سب سے پہلے فرشتوں نے استعمال کیا یعنی کہ نحن نسبح بحمدک و نقدس لک ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں اور تیری تقدیس بھی۔ اللہ تعالیٰ حمد کے آداب اور حمد کے انداز خود ہی سکھاتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو شجرِ ممنوعہ کے واقعہ کے بعد جب ندامت کا احساس ہوا تو پہلا جملہ ہی آپ نے یہ فرمایا کہ ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخٰسرین یعنی اے ہمارے رب ہم نے اپنے نفس پر جو ظلم کیا اس کی مغفرت فرما اور ہم پر رحم فرما کیونکہ ہم خسارے والوں میں سے ہوگئے ہیں۔ یہ سارے حمد کے آداب ہیں۔ رب ماننا' اپنے ظلم کا اعتراف کرنا' غفور ماننا اور رحم ماننا ہی ہماری حمد ہے۔ تو حمد کے جتنے بھی ممکن انداز ہیں وہ مولا کریم نے خود ہی سکھائے ہیں بلکہ اس کا اپنا ارشاد ہے کہ جتنی چیزیں آسمان اور زمین میں ہیں وہ ساری اشیاء ہی تسبیح بیان کر رہی ہیں یسبح للہ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض ساری اشیاء جو ہیں وہ تسبیح بیان کررہی ہیں۔ اللہ کریم ایک

اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے سمندر روشنائی ہوجائیں اور تسبیح اور حمد بیان کرنے پر آجائیں تو بھی حمد بیان نہیں ہوسکتی۔ تو حمد جو ہے غالبا" اس کا اپنا ہی کام ہے جس کی حمد ہے۔ تو جیسا کہ جیلانی کامران صاحب نے فرمایا کہ واردات ہے تو واردات ایک آنسو سے شروع ہوجاتی ہے' ایک احساس سے شروع ہو جاتی ہے اور جب واردات ہو جائے تو اس کے بعد جتنے بھی الفاظ ہوتے ہیں وہ واردات کا حصہ ہیں اور یہ واردات مولیٰ کریم خود ہی عطا فرماتے ہیں۔ مثلا" یہ دیکھیں کہ اسلام سے پہلے جو اللہ تعالیٰ کا تصور ہے وہ ایک روح کی نسبت سے تھا کہ ایک عظیم روح ہے جو نیچر میں چل رہی ہے۔ پھر اسلام نے آکر نور کا تصوّر دیا۔ ہمارے اردو ادب میں اسلامی ادب میں نور کا تصوّر جو ہے یہ بہت نمایاں چلا آرہا ہے ایک شعر ہے کہ ؎

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تابہ ماہی سب ہے ظہور تیرا
وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت
گر سرِ معرفت کو پاوے شعور تیرا

اس کا مقطع بھی ضرور دیکھیں ؎

گر حرفِ بے نیازی سر زد نیاز سے ہو
پتلے میں خاک کے ہے پیارے غرور تیرا

تو گویا کہ حمد کے جتنے بھی اشعار ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے اور مناجات و التجا ہے۔ جہاں انسان بے بس ہو جاتا ہے' بس وہیں سے

حمد کی بات شروع ہو جاتی ہے یعنی اپنی بے بسی کا اعتراف اور گناہ کا اعتراف انسان کو حمد کی طرف مائل کرتا ہے اور آگے کا سفر اللہ کریم خود ہی عطا فرماتے ہیں اور پھر انسان ان کی طرف چل نکلتا ہے اور پھر الفاظ بھی آتے ہیں اور انداز بھی آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاءِ کرامؒ نے حمد پر بڑا زور دیا ہے، ماننے والوں نے حمد پر بڑا زور دیا ہے اور جتنے لوگ مذہب میں آئے ان سب نے حمد پر بڑا زور دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے

ڈاکٹر سہیل احمد خان:

سلیم اختر صاحب! جیلانی کامران صاحب نے کچھ جدید ادب میں حمد کی طرف بھی اشارہ کیا تھا اور خاص طور پر ان شاعروں کے انہوں نے حوالے دیئے کہ جنہوں نے بطور خاص حمد کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ یعنی اپنے جذبات کے اظہار کا حمد کو ذریعہ بنایا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس جائزے میں کچھ وہ لوگ اور شاعر بھی شامل ہونے چاہئیں کہ جنہوں نے بطور خاص تو حمد کو ذریعہ اظہار نہیں بنایا لیکن کچھ حمدیں انہوں نے بڑی اچھی قسم کی لکھی ہیں اور کچھ جو ہمارے ہاں جدید شاعری کا لہجہ ہے اس کو کچھ پانے کی کوشش کی ہے اور خاص طور پر ناصر کاظمی اور منیر نیازی کی مثال میرے ذہن میں آتی ہے تو آپ اس سلسلے میں کچھ فرمایئے۔

ڈاکٹر سلیم اختر:

آپ نے منیر نیازی کا نام لیا تو ان کا ایک شعر بھی مجھے یاد آرہا ہے

شامِ شہر حول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آکر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

اب اگر ہم اس شعر کی معنویّت پر غور کریں تو اس سے ہمیں حمد اور حمد کہنے والے کا اور جس کے لیئے حمد کہی جا رہی ہے اس سے ایک تعلّق بنتا نظر آتا ہے کہ خوف کی فضا ہے' اور اس خوف میں وہی نور ہے جس نور کا ابھی جنابِ واصف علی واصف صاحبؒ نے ذکر کیا تھا' کہ خوف کے اندھیروں کو خدا کا جو نور ہے وہ آکر دور کرتا ہے' تو انسان کو تقویّت ملتی ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان :

اگر آپ اجازت دیں تو اس حمد کا اگلا شعر میں پڑھ دوں تو آپ کی بات ذرا واضح ہو جائے گی ۔

ماند پڑ جاتی ہے جب اشجار پر ہر روشنی
گھپ اندھیرے جنگلوں میں راستہ دیتا ہے تو

ڈاکٹر سلیم اختر:

تو جو میں بات کر رہا تھا اس شعر سے بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں تو حمد جو ہے وہ ایک لحاظ سے انسان کی ضرورت بن جاتی ہے اور بحیثیّت عبد کے اور عابد اور معبود کے جو ایک تکون سی بنتی ہے اس میں اگر ہم وہی شمع والے تارے کو

لیں تو حمد ایک شمع کا نام بنتی ہے اور ان تمام مناظر کو اجالے میں حسن دے دیتی ہے۔ ایک منظر خارج کا ہے اور ایک منظر داخل کا ہے۔ خارج کے منظر کی اتنی زیادہ اہمیت نہیں کیونکہ بات ساری باطن کی ہے، داخل کی ہے اور دل کی ہے۔ دل میں جب حمد کی شمع روشن ہوتی ہے تو پھر شاعر جس تخلیقی عمل سے گزرتا ہے وہ اسے بلند سے بلند تر کی طرف لے کر جاتا ہے بلکہ بلند تر سے بلند ترین کی طرف لے کر جاتا ہے لیکن ایک چیز میں محسوس کرتا ہوں کہ بہت سی حمدیں جو ہیں ان میں سے بلند سے بلند تر مقام پر جانے کے لیے ایک تخلیقی جست کی ضرورت ہوتی ہے جیسے آپ ایک سپرنگ بورڈ پر کھڑے ہوں اور آپ اوپر کی طرف چھلانگ لگاتے ہیں تو یا تو تخلیقی عمل کی کمزوری ہوتی ہے یا پھر خلوص کی کمی ہوتی ہے یا پھر شاید برائے شعر گفتن والی بات ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام تر کوشش کے باوجود ایک اچھا شعر نہیں بنتا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان:

جیلانی کامران صاحب! آپ اس بارے میں کچھ فرمائیں۔

پروفیسر جیلانی کامران:

میں اس بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں اور آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ حمد ہماری روایت میں ایک لمبے عرصے تک موجود رہی ہے اور درمیان میں ایک ایسا زمانہ بھی آتا ہے جب لکھنے والوں نے حمد کو اپنے تخلیقی عمل میں شامل نہیں کیا اور

ان کی کتابوں میں کبھی ہمیں حمد دکھائی نہیں دی اور پچھلے چار پانچ برسوں کے دوران ہمیں ایک نئے شعری تجربے کے طور پر ابھرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ روایت کے دنوں میں یعنی ہمارے عظیم عروج کے دنوں میں جب حمد عربی میں' فارسی میں یا علاقائی زبانوں میں لکھی جاتی تھی وہاں آپ علاقائی زبانوں میں ہی حمدیہ شاعری کو دیکھئے' آپ ان کا معیار دیکھئے وہ آپ کو تمام تر بلندیوں پہ نظر آتی ہے۔ میں سمجھتا یہ ہوں کہ حمد محض ایک صنف نہیں بلکہ یہ تجربہ ہے اور جب ایمان تجربہ بنتا ہے تو اس وقت جو بھی حمد لکھیں گے اس میں شاعری ہو گی اور اس کا ایک معیار ہو گا' اس کا ایک مقام ہو گا۔ روایت کے دنوں میں یا ہمارے کلاسیکی ادب میں ایمان ہمارا ایک مجموعی اور انفرادی تجربہ ہے اور اس تجربے کی تازگی ہمارے پورے کلچر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارا کلچر اس زمانے کی دنیا میں ایک نیا کلچر تھا' ایک منفرد کلچر تھا اور ہم دنیا کو دینے والوں میں سے تھے۔ اس لیے اس زمانے میں ہم نے جو ادب تخلیق کیا اس میں ہماری حمد کی ایک عجیب و غریب شکل تھی۔ اب اس زمانے میں حمد جب ہم دوبارہ لکھ رہے ہیں اس کا مجھے ایک اور جواز دکھائی دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ایک سیکولر دنیا میں سانس لے رہے ہیں اور محل وقوع کے اعتبار سے دنیا کا ماحول سیکولر ہو چکا ہے۔ اس میں ہم اپنی نشاۃِ ثانیہ کا ذکر کرتے ہیں اور ہمارا جو کائناتی نقطہ نظر ہے وہ Theocentric ہے اور God centred ہے' اس لیۓ ہم اپنی شناخت کے لیۓ حمد کو استعمال کر رہے ہیں اور

اپنے اس پر آشوب دور سے نکلنے کی دھواں دھار کوشش کر رہے ہیں وہ Existentialism کی زبان نہیں ہے بلکہ وہ Limited situation کی بات ہے جس طرح منیر نیازی کی حمد کا شعر تھا۔ مقصد یہ ہے کہ جب ہمارے تمام آسرے ٹوٹتے ہیں تو اللہ ہمیں راستہ دیتا ہے۔ اب چونکہ ہم حمد کو دریافت کر رہے ہیں' اس تجربے کو دریافت کر رہے ہیں' اس وسیلے کو دریافت کر رہے ہیں جو ایمان کی زبان میں خدا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ حمد کا ایک نیا دور ہے اور ایک نئے رشتے کا دور ہے جو تخلیقی انسان اس قادر مطلق کے ساتھ قائم کرے گا لیکن ہمارا تخلیقی انسان بھی ہمارے سیکولر حدود اربع میں اپنی ایمانیات کی تلاش کر رہا ہے۔ تو جب وہ اس تلاش میں کامیاب ہو جائے گا تو ہمارے ہاں حمد کی ایک نئی صورت ظاہر ہو گی۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان :

جنابِ واصف صاحب! جیلانی صاحب کی بات سے ایک بات نکلتی ہے کہ واردات تو بہت قدیم ہے یا اصل سے اس کا تعلق ہے' وہ تو ماٗخذ ہے' سرچشمہ ہے اور کسی زمانے میں اس میں تغیر نہیں آتا' لیکن زمانوں کے جو اپنے اپنے حالات ہوتے ہیں تو اس کے مطابق شاید اظہار میں کچھ تغیر آ جاتا ہے۔ تو آج کے انسان کے لیئے کون سا لہجہ یا کون سی زبان یا کون سا استعارہ ہونا چاہیے' جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا ہمارا قدیم ادب ہے وہ سارا عشقیہ

لہجے میں گفتگو کرتا ہے۔ تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم اس آشوب
کے زمانے میں کیسے اس کو بیان کر سکتے ہیں یعنی اس تجربے کو کیسے
بیان کر سکتے ہیں؟

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

حمد کے معنوں میں تعریف کے علاوہ شکر کا مفہوم بھی ہے۔
اگر آپ اس موجود زندگی کو اللہ کا احسان مانتے ہوئے شکر ادا کرنا
شروع کریں تو یہ بھی ایک حمد کا پہلو ہے۔ تو وہ لوگ جو زندگی پر
شاکر ہیں' زندگی پر مطمئن ہیں' اس پر راضی ہیں تو یہ حمد کا ایک نیا
انداز ہے۔ مثلاً" ہم کسی نعمت کی بات کریں جیسے پاکستان حاصل کیا
ہے تو جو لوگ اس نعمت پر شکر کر رہے ہیں وہ تو Main لوگ ہیں
جو اس بات کو اللہ کا احسان مانتے ہیں۔ تو یہ بھی حمد کا ایک پہلو
ہے۔ تو یہ حمد کے کئی ممکن انداز ہیں۔ تو ہر وہ چیز سفر کا حصہ ہے جو
ذات باری تعالیٰ کی طرف لے جائے' وہ چاہے شکر ہو' احسان ہو'
جزا ہو' ادائے حق ہو یا کسی اور طرح بھی ہو' وہ سارے کا سارا حمد
میں شامل ہوتا ہے۔ اس لیے جب ہم نیا پہلو Discover کر رہے
ہیں تو بہت جلدی اللہ تعالیٰ کوئی سبب بنائے گا اور بات مزید واضح
ہوتی جائے گی۔

پروفیسر جیلانی کامران:

اس میں میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر حمد کو صرف
"ح" "م" اور "د" کے ساتھ لکھا ہوا نہ دیکھیں تو اس کا یہ

مطلب نہیں ہے کہ ہماری تحریروں میں حمد شامل نہیں ہے۔ اگر ہم محسوس کریں تو جدید شاعری میں جو نثریں، تحریریں، نظمیں اور آزاد نظمیں لکھی جا رہی ہیں ان میں ایک لہجہ حمد کا موجود ہے۔ جہاں کہیں بھی ضمیر مخاطب "تو" اور ضمیر غائب "وہ" ظاہر ہوا تو اس کے رشتے دور تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں خواہ یہ ن۔ م۔ راشد میں دکھائی دے، خواہ یہ منیر نیازی کی شاعری میں ہو یا ہم میں سے ایک کی تحریروں میں ہو، تو وہ حمد کا رنگ ہماری ادبی سرشت کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

حمد کی تعریف اگر یوں کی جائے کہ نعمت سے، منعم سے رجوع کرنا حمد ہے تو جو نعمت ہمیں حاصل ہو رہی ہے اس کا شکر منعم سے کیا جائے اور اُسے منعم کا احسان مانا جائے تو یہ ایک حمد ہے۔ تو اپنے ماحول سے اور اپنے حال سے جو شخص، جو انسان راضی ہے اور اس کی رضا جو ہے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی ہے تو یہ ایک حمد کا پہلو ہے۔ اس طرح حمد کے بہت سے امکانات پیدا ہو سکیں گے، ہماری قومی سطح پر بھی، ذاتی سطح پر بھی۔ تو ادب میں ابھی کتنی ہی گنجائش ہے یعنی بہت ساری گنجائش ہے مثلاً" ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۔

لا اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

تو اپنے مقام کو دریافت کرنے کے لیے بھی حمد کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ تو اپنے ہر مقام کے لیے اور اپنی ہر ضرورت کو پورا کرنے کے لیے حمد کا سہارا لیا جا رہا ہے۔

پروفیسر جیلانی کامران:

پھر اس سے حمد کی ایک خاص شکل بھی ہو گی لیکن حمد میں ہمیں خاص قسم کے الفاظ دیے ہوئے ہیں۔ ایک خاص قسم میں جب ہم حمد کو دیکھتے ہیں کہ یہ حمد ہے تو اس کے لیے ایک Stock vocabulary ' ایک خاص قسم کی لفظیات ہے کہ جس طرح حافظ لدھیانوی نے لکھا ہے یا جس طرح حفیظ تائب کرتے ہیں لیکن میں یہ سوچتا سمجھتا ہوں کہ جیسے واصف صاحب نے فرمایا کہ شکر گزاری کا جو لہجہ ہے یہ ہماری جدید حمدیہ شاعری کی بنیاد بن سکتا ہے کیونکہ یہ زندگی کو اثباتی رنگوں میں دیکھتا ہے اور زندگی کی نفی کرنے والے قوتیں ہیں ان سے انکار کرتا ہے اور جب زندگی کو اثباتی نگاہ سے دیکھے گا تو اس سے وہ اپنا شکر ادا کرے گا چاہے خدا اس کا خواب ہو' عقیدے کے مطابق نام نہ لے بلکہ ضمیروں میں اس کا نام لے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے شاعری کی ایک نئی صورت پیدا ہو سکتی ہے جو اثباتی ہو گی' جو انسان کو زیادہ تسکین دے گی اور جو ایک آنے والے زمانے کی طرف انسان کی رہنمائی کر سکے گی اور انسان کے لیے زندگی کی مصیبتوں میں خوشی کا ایک مقام میسّر کر سکے گی۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ حمد ہمارے تخلیقی عمل کا

ایک بنیادی عنصر بن چکا ہے۔ اس میں روایت کو دخل ہے' اس میں ہمارے لکھنے والوں نے بھی کوششیں کی ہیں' اس میں ہمارے مذہب کا ظاہر ہے کہ بنیادی Contribution ہے۔ لیکن ہمارے ادب میں حمد جو ہے اسے کسی صورت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کبھی غیر موجود رہی ہے۔ حمد جس زمانے میں نہیں لکھی جاتی تھی اس زمانے میں بھی موجود ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان:

بعض اوقات ایسے شاعر جن کے بارے میں فوری طور پر ذہن میں نہیں آتا کہ انہوں نے بھی اس رنگ میں بھی شعر کہے ہوں گے تو ان کے ہاں بھی ایسے ایسے عجیب و غریب شعر نکلتے ہیں کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے جیسے ناصر کاظمی مرحوم نے داغ کا ایک شعر سنایا اور آپ دیکھئے کہ نور کی بات واصف صاحب نے فرمائی تھی تو ہماری صوفیانہ روایت میں جو نور کے مختلف رنگ ہیں وہ کس انداز سے اس میں جھلکے ہیں تو داغ کا شعر ہے ۔

قمر کو پردۂ شب' تو بصر کو پردۂ چشم
تو کئی لباس تیرے نور کو سیاہ ملے

اب آپ دیکھئے کہ داغ نے یہ بات کی اور اس کے ساتھ ہی ناصر کاظمی نے یہ بات کی۔ اس کے ساتھ وہ ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی ابتدائی جو غزل ہے اس میں لکھا ہے کہ ۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا پہلے تیرا نام لکھا تھا
لکھ لکھ ہارے لکھنے والے کاغذ کورے کا کورا تھا

تو روایت میں بھی اور جدید شاعری میں بھی حمد کی جو صورتیں ہمارے ہاں نمایاں ہوئیں جیلانی کامران صاحب نے بڑی خوب صورتی سے جو ان کی وضاحت کی اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ واصف صاحب نے ان کی جو مذہبی بنیادیں ہیں اس کی طرف بہت ہی خوب صورتی سے اشارہ کیا۔ تو میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

○

۸
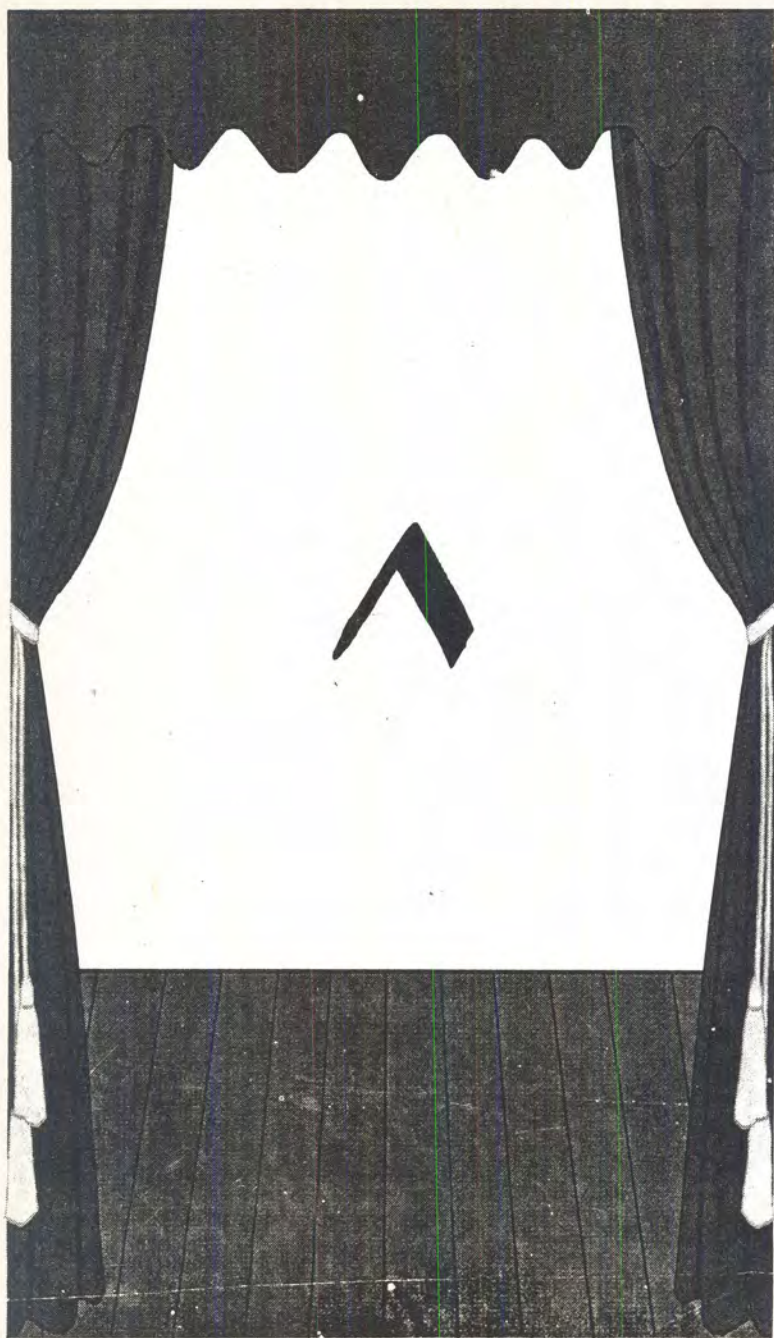
یکم جنوری ۱۹۸۳ء کی شام ہوٹل میٹرو پول کراچی میں سیّد اخلاق حسین کی کتاب "پاتھ ٹو پیس" کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی۔ اس پُر وقار تقریب میں ملک کی نہایت نامور شخصیّات نے شرکت کی۔ سیّد اخلاق حسین توحیدی ایک مشہور اور اعلیٰ سول سرونٹ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ نسبت اور فیض یافتہ بزرگ تھے جن کا حلقۂ ارادت ملک سے زیادہ بیرون ممالک خصوصاً امریکہ میں تھا۔ تقریبِ رُونمائی کے لیے جناب واصف صاحب خصوصاً کراچی تشریف لے گئے اور اس پُروقار تقریب کی صدارت فرمائی۔ تقریب کے اختتام میں آپ نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ کا متن پیشِ خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب "پاتھ ٹو پیس" کی تقریبِ رُونمائی میں

صدارتی خطبہ

خواتین و حضرات! ہم اس وقت نہایت مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں تذبذب اور ہنگامے ہیں۔ آج کا انسان مشینوں کے ذریعے تو ترقی کرتا جارہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ احساس کی دنیا میں انحطاط پیدا ہوتا جارہا ہے۔ ترقی کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ خوشی بھی حاصل ہو اور تحفظ بھی۔ انسان خلاؤں کو تو مسخّر کرچکا ہے لیکن اپنی ذات کی تسخیر کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہوچکا ہے۔ وہ دیکھتا نہیں مگر اس کے اپنے ہی اندر اللہ کی ایک وسیع کائنات موجود ہے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ کوئی بھی تحفّظ اسے موت سے محفوظ نہیں کرسکتا' اس موت سے جو اس زندگی کا آخری انعام ہے۔ درحقیقت تحفّظ کی تمنّا ہی اسے غیر محفوظ بنا رہی ہے اور فانی انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔

خوشی ہمارے اندر ہوتی ہے۔یہ روح کی ایک حالت کا نام ہے' اس کا مادی ترقی اور خوشحالی سے تعلّق ہی نہیں ہے جس کے لئے انسان کوشش کرتا رہتا ہے۔ سیّد اخلاق حسین کی یہ کتاب "پاتھ ٹو پیس" ہمیں ہمارے اندر کی خوب صورت کائنات سے روشناس کراتی ہے' وہ کائنات جو ہمارے اندر مخفی ہے۔ یہ ایک نہایت پر اعتماد کاوش ہے جس کے نتیجے

میں دورِ جدید کے انسان کو یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنی سوچ کی اصلاح کرلے، اپنے نظریات کو پھر سے تشکیل دے اور اپنے ایمان کی تجدید کرے تاکہ اس کا باطن نئے سرے سے سنور جائے۔ مصنّف نے بڑی کامیابی سے صوفیاء کرام کے اسرار و رموز سے لبریز بکھرے ہوئے موتیوں کو اکٹھا کیا ہے، اب یہ قاری کی ذمّہ داری ہے کہ وہ ان موتیوں سے افادہ کرے۔ اگرچہ اس کتاب میں ظاہری طور پر کوئی نیا موضوع تو نہیں ہے لیکن انسان کی روحانی ترقی اور ارتقاء کے لئے یہ ایک نئی روشنی ثابت ہوگی۔ اس کتاب کے ذریعے ہمیں اہلِ تصوف کی روشن دنیا میں داخل ہونے کے نئے راستے ملتے ہیں۔ مصنّف نے یہ کوشش کی ہے کہ ماڈرن دور کے انسان کی زندگی میں جو تضادات پیدا ہوچکے ہیں انہیں حل کیاجائے۔ آج کے انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر ایک نئی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں الجھنوں اور تضادات کے اندر مزید اور تضادات پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس کتاب میں مصنّف اپنے قاری کی انگلی پکڑتا ہے اور اسے اڑا کر ایک ایسے جزیرے میں لے جاتا ہے جہاں سکون اور نعمت ہی نعمت ہے۔ وہاں پر نہ کوئی تضاد ہے اور نہ کوئی الجھن بلکہ محبّت ہی محبّت ہے۔ یہ محبت ہی تو ہوتی ہے جس کے ذریعے زمانے کے اندھیرے قلزم میں روشنی کی نئی کرنیں پیدا ہوتی ہیں ۔ محبّت حسن کے قریب ہونے کی خواہش کو کہتے ہیں۔ جب حُسن کے قرب کی خواہش پیدا ہوجائے تو دل میں محبت جاگ اٹھتی ہے۔ محبّت بھرے دل میں دعا پیدا ہوتی ہے اور یہ دعا ہمیں سکون کی طرف لے جاتی ہے۔ انگریزی کے ایک مشہور شاعر نے کہا ہے "جو جتنا محبت کرنے والا ہوتا ہے وہ اتنی ہی دعا کرنے والا ہوتا

ہے' چاہے وہ انسان ہو پرندہ ہو یا جانور ہو"۔ محبت ہی وہ کنجی ہے جس سے باطنی دنیا کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ جب اس حقیقی محبت کا دروازہ کھل جاتا ہے تو ہمارے سارے ابہام ختم ہوجاتے ہیں۔ پھر انسان کو سمجھ آتی ہے کہ یہ کائنات اللہ کی تخلیق ہے اور اس میں کوئی چیز باطل نہیں ہے۔ ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا یعنی "اے ہمارے رب تونے کوئی چیز باطل تخلیق نہیں کی"۔

مصنّف نے ہمیں وہ راستہ دکھایا ہے جس کے ذریعے ہم اللہ کی رضا کو پہچان کر تسلیم میں داخل ہوسکتے ہیں اور ایک مرتبہ جب اللہ کی مشیت کی پہچان ہوجائے تو پھر نہ ہی کوئی تضاد رہتا ہے' نہ کوئی الجھن رہتی ہے اور نہ کوئی تکلیف رہتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو یہ کتاب دین اسلام کا ہی ایک تعارف ہے کیونکہ دین اسلام اللہ کی رضا کو تسلیم کرلینے کا ہی نام ہے۔ ہمارے صوفیاء کرام کے نظریات کے مطابق دین اسلام ہی اللہ کی طرف سے پہلا اور آخری دین ہے اور انسانیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسی دین کو پسند فرمایا ہے اور اس کی بنیاد انسان اور انسانیّت پر رکھی گئی ہے۔ یہی بات بڑی وضاحت سے اس کتاب کے صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ابواب گوناں گوں موضوعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً" عشقِ حقیقی' عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم' نماز' دعا اور علم وغیرہ۔ سید اخلاق حسین نے اس کتاب میں بڑی خوب صورتی سے اس نکتے کی وضاحت کی ہے کہ عشقِ حقیقی صرف اللہ سے محبت کرنے کو نہیں کہتے بلکہ اللہ کے عمل سے پیار کرنا بھی عشقِ حقیقی ہے' اللہ کی مخلوق سے پیار کرنا بھی عشقِ حقیقی ہے اور اللہ کے احکام سے پیار کرنا بھی عشقِ حقیقی

ہے۔ ہمیں خدا کے بارے میں تحقیق نہیں کرنی بلکہ اسے تسلیم کرنا ہے اور اس کی رضا کے آگے سجدہ کرنا ہے جو اس بات کا اعلان ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارے لئے سب کچھ ہے۔ جیسا کہ خواجہ غلام فریدؒ نے فرمایا ۔

میڈا عشق وی توں
میڈا یار وی توں
میڈا دین وی توں
ایمان وی توں
میڈا کعبہ قبلہ مسجد منبر
مصحف تے قرآن وی توں

اس طرح سیّد اخلاق حسین نے اللہ کی رضا کے آگے مکمّل طور پر سرِ تسلیم خم کرنے کا درس دیا ہے۔ پھر ہم جس چیز کو بھی دیکھیں اس میں ہمیں محبّت کا ایک جلوہ نظر آئے گا پھر ہر چہرے سے ہی اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا پتہ ملے گا۔

ہر چہرے میں آتی ہے نظر یار کی صُورت
احباب کی صُورت ہو کہ اغیار کی صُورت

پھر یہ حالت طاری ہوجاتی ہے کہ انسان اس دنیا میں جگہ جگہ اپنے خالق کا جلوہ دیکھتا ہے۔

یار کو ہم نے جابجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
کہیں ہے بادشاہ تخت نشیں
کہیں کاسہ لیئے گدا دیکھا

کتاب کے مصنّف نے ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو اللہ سے محبّت کا دعویٰ تو رکھتے ہیں مگر اللہ کی مخلوق سے نفرت کرتے ہیں۔ اللہ تو محبّت ہے اور انسان اس محبّت کو حاصل کرنے والا ہے ۔

معمور ہو رہا ہے عالم میں نور تیرا
از ماہ تابہ ماہی سب ہے ظہور تیرا
وحدت کے ہیں یہ جلوے نقش و نگار کثرت
گر سرِ معرفت کو پاوے شعور تیرا

اس کتاب کے ذریعے سیّد اخلاق حسین نے ہمیں اس محبّت کا پیغام دیا ہے جس محبّت کے بغیر عقیدہ متزلزل رہتا ہے۔ اسلام صرف عبادت ہی نہیں بلکہ اللہ کی تلاش کا نام ہے۔ جیساکہ شاہ لطیفؒ نے فرمایا ہے کہ

"روزہ نماز جیسی نیکی اچھا کام ہے لیکن ان سب سے افضل کام اپنے خالق کی تلاش کا کام ہے"۔ محبّت دوسروں کے احساسات کی قدر کرنا سکھاتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی محبّت سے آباد دل خانہ کعبہ سے بہتر ہوتا ہے ۔

دل بہ دست آور کہ حجِ اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنیاد خلیل آزر است
دل گزر گاہ جلیلِ اکبر است

یعنی "اللہ کی محبت سے آباد ایک دل ایسے ہے جیسے حج اکبر ہو اور ایسا ایک دل ہزاروں کعبوں سے بہتر ہے کیونکہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیم

خلیل اللہ علیہ السلام نے رکھی جب کہ دل اس جلیلِ اکبر کی گزرگاہ ہے"۔

تو محبّت والے اور خاص طور پر عشقِ حقیقی والے کے لئے نفرت کا کوئی جواز نہیں۔ اگر ہم انسان کو اس نظر سے دیکھیں جس نظر سے اللہ دیکھتا ہے تو کسی سے نفرت نہ کریں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام جہانوں کے لئے اسی محبّت اور رحمت کا پیغام بن کر آئے۔ اس لئے آپؐ کا لقب رحمتہ اللعالمینؐ ہے۔ صوفیاء کرام نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ جن کے پاس یہ نعمت نہیں ہے ان کی عزت بھی کی جائے اور ان تک یہ نعمت بھی پہنچائی جائے۔ صرف عبادات سے ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا بلکہ اس محبت کے ذریعے ہمارے ایمان کی تکمیل ہوگی۔ محبّت ہر وقت اپنے محبوب کی خوشنودی کا موقع تلاش کرتی رہتی ہے۔ یہ بات اس چھوٹی سی مثال کے ذریعے بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ آجائے گی کہ وہ لوگ جنھوں نے امام حسینؑ کو شہید کیا انہوں نے اس قتل کے بعد نماز بھی ادا کی۔ یہ محبّت سے محروم عبادت کرنے والے مسلمان تھے۔ تو محبّت کے بغیر کوئی ایمان ہرگز ایمان نہیں ۔

عشق نہ ہو تو شرع و دین بت کدۂ تصوّرات

یعنی "اگر عبادت میں اللہ کی محبت شامل نہ ہوتو مسلمان کا دین اس کے اپنے تصوّرات کا ایک بتکدہ ہے"۔ جس طرح اللہ سے محبّت عشقِ الٰہی ہے اسی طرح اللہ کے اولیاء سے محبّت بھی عشقِ الٰہی ہے ۔

شرع کہے چل مسجد اندر حق نماز ادا کرلے
عشق کہے بوہا یار دا کعبہ قدماں اتے سر دھرلے

شرع کہے اساں شاہ منصور نوں سولی اتے چاڑھیا سی
عشق کہے تسیں چنگا کیتا بوہے یار دے واڑیا سی

صوفیاء کرام نے محبّت کا یہ فیض ایسے احسن طریقے سے پھیلایا کہ لوگ جوق درجوق ان کے گرد جمع ہوتے گئے اور اسلام میں داخل ہوتے گئے اور اس طرح وہ اسلام کی اس نعمت سے فیض یاب ہوئے۔

ایک اور اہم بات مصنّف نے یہ بات واضح کی ہے کہ حضور پاکؐ سے محبت افضل ترین محبّت ہے اور انسان کی نجات کا ذریعہ ہے۔ کتاب کا مصنّف حضور پاکؐ سے دست بستہ اس طرح عرض کرتا ہے ۔

"اے کالی کملی میں لپٹے ہوئے ہمارے سرکارؐ میرا عاجزانہ سلام قبول فرمائیں!

میں اس وقت اس وِقّت میں ہوں کہ اپنے بکھرے ہوئے احساس' جذبات بیان کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔

آپؐ کے رحمت کے وسیع قلزم کا ایک قطرہ بھی مجھے نصیب ہو تو میں بڑا خوش نصیب گنا جاؤں گا۔

اور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم آپؐ پر درود پڑھتے ہیں اور آپؐ کے غلاموں کے بھی غلام ہیں"۔

مصنّف نے اس کتاب کے اندر ۶۴۰ احادیث منتخب کرکے پیش کی ہیں جو آج کے انسان کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ ان احادیث کو غور سے پڑھے اور سمجھے۔ اس کے بعد درود شریف کے بارے میں ایک نہایت جامع باب لکھا گیا ہے۔ دعا کے باب میں مصنّف اپنی دعا اس طرح پیش کرتا ہے ۔

"میری روح کے اندر پیدا ہونے والے جذبات
اور میرے سینے کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ
جب بیان ہوتی ہے
تو دعا بن جاتی ہے
میری آہ بھی ایک دعا ہے
میرے آنسو کا گرنا بھی ایک دعا ہے
اور میری نگاہوں کا آسمان کی طرف اٹھنا بھی ایک دعا ہے
کیونکہ اس وقت اللہ میرے قریب ہوتا ہے"

کتاب کے مصنّف سیّد اخلاق حسین کا یقین اور اعتماد ہے کہ دل سے مانگی ہوئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔ اس طرح مصنّف اپنا امن اور آشتی کا پیغام بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے قاری تک پہنچاتا ہے۔ یہ پیغام ہمیں دوسروں کی عزت کرنا سکھاتا ہے' دوسروں کا احترام کرنا سکھاتا ہے اور دوسرے انسانوں کے کام آنا سکھاتا ہے' یہ اس خیال کی پیروی ہے کہ۔

مسجد ڈھا دے مندر ڈھا دے
ڈھا دے جو کجھ ڈھیندا!
اک بندے دا دل نہ ڈھاویں
رب دلاں وچ رہندا

ایسی کتاب پیش کرنے پر سیّد اخلاق حسین ہماری مبارک اور داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ ہم ان کی صحت اور درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہیں۔

آج یکم جنوری ۱۹۸۳ء کی صبح اس کتاب کے ساتھ ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم دعا کرتے ہیں کہ یہ سال اور یہ کتاب مصنّف کے لئے، تمام حاضرین کے لئے اور تمام قارئین کے لئے خوش قسمت ثابت ہو۔ آپ سب لوگوں کو نیا سال بھی مبارک ہو اور اس کتاب کے صفحات کا سفر بھی مبارک ہو۔ والسلام

○

۹
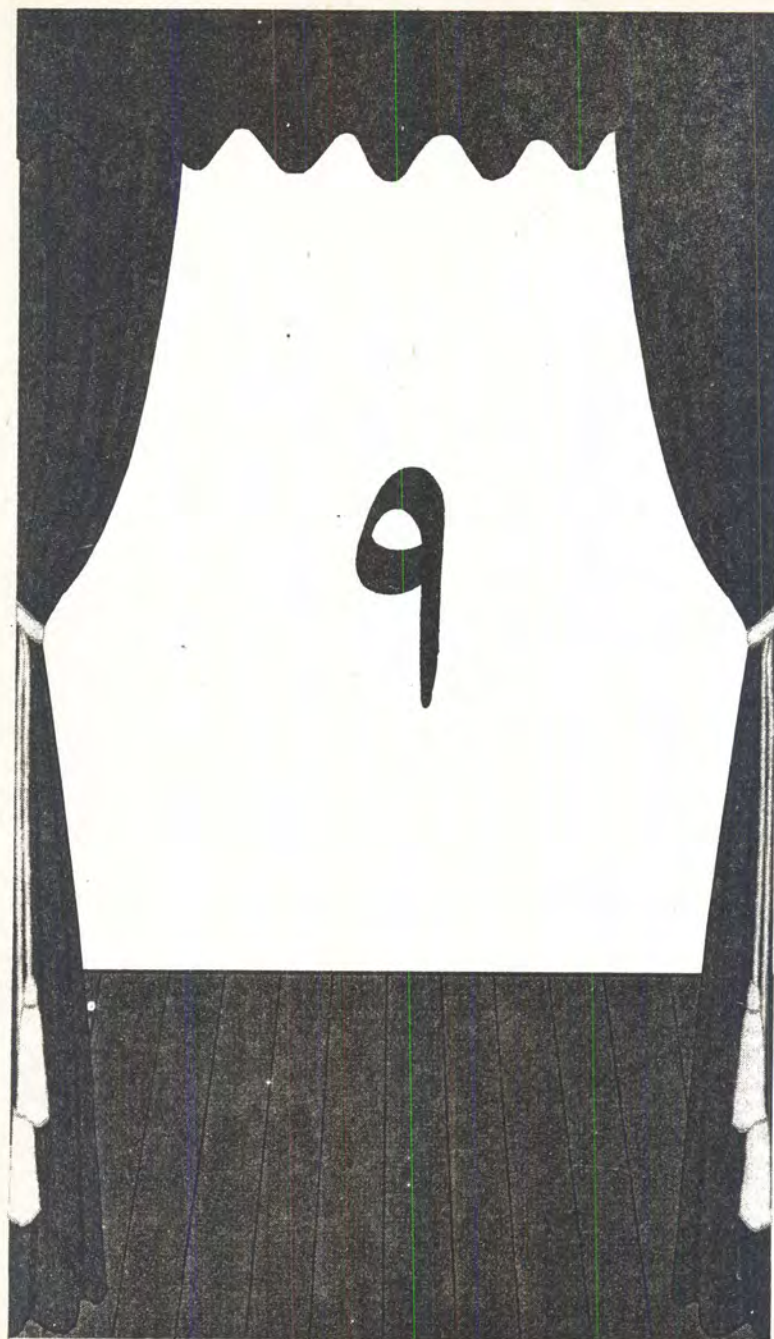
قبلہ واصف صاحبؒ سے یہ ملاقات محترم نذیر ناجی اور عبدالرؤف نے کی اور اس میں ایسا مکالمہ ہوا جس میں بہت سے متنوّع موضوعات زیرِ بحث آئے۔ گوناگوں سوالات کے جوابات جس طرح واصف صاحبؒ نے دیے وہ انہی کا خاصّہ ہے' انہی کا اپنا ذاتی فن ہے اور بجا طور پر اسے ان کی اپنی صنف کہی جا سکتی ہے۔ پہلے تو وہ سوال کا تجزیہ کرتے ہیں' پھر سوال کے اندر چھپی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں اور پھر ایک وسیع النظر رُوحانی اور الوہی طور پر ودیعت علم کے ذریعے سوال پوچھنے والے کے ذہن کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ اس مکالمہ کا اعجاز یہ ہے کہ سوال پوچھنے والا سوال کے بوجھ سے آزاد ہونے کے بعد ایک نئے علم سے روشناس کرا دیا جاتا ہے۔ یہ مکالمہ پڑھ کر قاری کو بخوبی ان کے فنِ مکالمہ پر دسترس کا احساس ہوتا ہے۔

واصف علی واصفؔ سے ایک ملاقات

نذیر ناجی:

جناب واصف صاحب! آپ سے چند باتیں کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آپ کے ساتھ انٹرویو کرنا دشوار ہے' مجھے تو مکالمہ بھی مشکل نظر آتا ہے۔ آپ جن دنیاؤں کی تسخیر کو نکلے ہیں ان پر منطق کی کمندیں نہیں ڈالی جاسکتیں۔ یہ تمثیل و مشاہدے کا کچھ صوفیانہ' کچھ شاعرانہ اور آپ معاف فرمائیں تو قدرے مجذوبانہ سا عمل ہے' اس میں آپ کے سائے سائے تو چلا جاسکتا ہے اور موقع ملنے پر ادھر ادھر جھانکا جا سکتا ہے لیکن تجلی کی تمنا میں بھسم ہونے کا خطرہ ہے۔ لہٰذا میں ڈرتے ڈرتے آپ کے پیچھے چلنے کی کوشش کروں گا اور کبھی کبھی ایک متحیّر بچے کی طرح انگلی کے اشارے سے یہ پوچھ لیا کروں گا کہ ادھر کیا ہے؟ تو جناب ادھر ایک کائنات ہے۔ ہم چیزوں کو بنا ہوا دیکھ کر سوچتے ہیں کہ انہیں کوئی بنانے والا بھی ہے۔ علّت و معلول کے زینے طے کرتے کرتے ہم جب آخری کڑی تک آتے ہیں تو یہ سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ایک ایسی حقیقت سے واسطہ ہے جسے کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ فہم وادراک کو چھوڑ دیں تو اس کڑی سے آگے چلنے کے کئی راستے ملتے ہیں۔ نہ چھوڑیں تو رک جانا پڑتا ہے ورنہ راستے نکالنے کے لیئے بالائے منطق طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ مثلاً ہندومت میں اس حقیقت کو

صفات میں تقسیم کر کے اشکال دے دی گئی ہیں۔ ان کا ہر بت بھگوان کا ایک روپ ہے۔ بت جدا جدا ہیں لیکن ان میں وہ وحدانیّت ہی دیکھتے ہیں مگر ان کا عام آدمی اسی بت کو خدا سمجھ لیتا ہے۔ میں یہ تجربہ دیکھتا ہوں کہ اگر ہم شکلوں میں دیکھیں تو پھر خدا تجربہ نہیں بن پاتا' خالق تجربہ نہیں بن پاتا۔ اس کے برعکس چند تعریفیں جو مبہم سی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں' صرف ان کی جھلک نظر آتی ہے' تو پھر حرکت کا تمام کا تمام نظام مکمل ہوتا ہی نہیں۔ پھر جیسے ایک تعریف قرآن پاک میں بھی ہے کہ دہر کو خدا کہا گیا ہے' اس کی کوئی حد' کوئی جسم بندی نہیں کرسکتے' لیکن پھر وقت کو اگر ہم جدید خلائی عہد کے حوالے سے دیکھیں تو وہ رفتار کا غلام ہے یعنی آپ جو سفر کسی سمت میں طے کرتے ہیں اس کی مدت کے حوالے سے وقت کا تعیّن ہوتا ہے۔ یوں زمان و مکان کی بحث آجاتی ہے۔ پھر ایک وہ نظریہ ہے جو تین بنیادی عناصر سے معروف ہے جن کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام نے کہا کہ در حقیقت دو ہیں اور وہ کہتے ہیں دو بھی نہیں' وہ اسے ایک ثابت کریں گے۔ وہ اس کوشش میں ہیں۔ پھر یہ ایک ہونا' اسے یکتا کہیں یا وحدانیت' اس میں کوئی ایک خدا' کوئی الگ مخلوق' یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آتیں بلکہ ہماری سمجھ میں تو صرف سارا کچھ ایک ہونا آتا ہے۔

واصف علی واصف صاحب:

اس کی بڑی آسان سی وضاحت ہے ایمان' ہمارا دین اسلام ہے' ہم نے خدا کو مانا ہے اور ایک انسانِ کامل کی صداقت پر اعتبار سے ہم نے خدا کا ہونا تسلیم کیا ہے۔

نذیر ناجی:

بلکہ یہ کہ جتنا کچھ کلام ہم نے سمجھا اتنا خدا ہماری سمجھ میں آیا ہے' باقی نہیں۔

واصف علی واصف صاحب:

دیکھئے میں یہ کہہ رہا تھا کہ پیغمبروں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے خدا کو منوایا ہے جسے انہوں نے دکھایا نہیں ہے۔ صداقت کی اتنی بڑی مثال ہمارے سامنے اور کوئی نہیں ہے۔ حالانکہ لوگ دوسری باتوں میں ہزار طرح کی مثالیں اور اسناد مانگیں گے مگر یہ انہوں نے مان لیا اور یہ پیغمبروں کا کمال ہے اور اس کے بعد آپ یہ کہیں کہ یہ ہمارا عقیدہ بن جائے۔ تو عقیدے کی بات یہ ہے کہ ہم نے خدا کو نہیں مانا' ہم نے عقیدے کے بعد معبود کو مانا ہے۔ معبود میری عبادت سے متعلق ہے اور باقی کائنات میں اس کے جو رنگ ہیں وہ مکمل رنگ ہیں۔ خدا وہ ہے جس نے کافروں کو بھی پیدا فرمایا ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی کہ میں یہ بات زور دے کے کہتا ہوں کہ ہمارے یہ ساتھی مسلمان ہو جائیں لیکن مجھے یہ سوچنا چاہئے کہ کیا میرا اللہ چاہتا ہے ان کا مسلمان ہونا اور کیا وہ اپنی سوچ اور اپنی خواہش پر قادر ہے؟ تو اگر سوچ بھی ہے اور خواہش بھی ہے تو پھر خود ہی اس کا اہتمام فرما لے مگر وہ تو اس کو رزق دے رہا ہے۔ یہاں ایک لطیفے کی بات بھی سن لیں' ایک بزرگ لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے کہ تم لوگ نماز نہیں پڑھتے' روزہ نہیں رکھتے' اگر تم لوگ یہ کرنے لگو تو خدا تمہیں ایٹمی قوت سے نوازے

گا۔ تو جلسہ ہی میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا کہ "یہ فرمائیں کہ اس نے پہلے جن کو ایٹمی قوت سے نوازا ہے وہ کون سی نماز پڑھتے ہیں یا روزہ رکھتے ہیں؟" تو اصل میں بات یہ ہے کہ نماز میری عاقبت ہے اور میری زندگی دوسروں کی عاقبت ہے۔ جتنے بڑے مرتبے پر میں ہوں گا' اتنا ہی زیادہ میری زندگی دوسروں کی عاقبت ہوگی۔ جوں جوں میرا سٹیٹس بڑھے گا توں توں اضافہ ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ ہم نے معبود کو مانا ہے' معبود اور عابد' رشتہ عبادت' جس طرح محبوب' محب اور رشتہ محبت' پھر خالق کی بات تو بڑی واضح ہے' خالق' مخلوق' رشتہ تخلیق۔

نذیر ناجی:

تو اصل رشتہ عملِ تخلیق کو آگے بڑھانے کا عمل ہے؟

واصف علی واصف صاحب:

میں اس کو یہ کہوں گا کہ ہمارے اعتقاد کے علاوہ فنکشن جو مجھے پتہ ہے بس یہی فنکشن ہے اس لئے کہ عقیدہ کہیں درمیان سے مفقود ہی نہ ہو جائے۔ عقیدہ کوئی مان لو' جس طرح پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے لئے مسافر کو علم ہو سکتا ہے کئی راستوں کا' لیکن سفر کرنے والا ایک ہی راستے سے سفر کرے گا' باقی دور رہ جائیں گے۔ اگر آپ نے چوٹی پر جانا ہے تو کسی ایک راستے سے چل پڑو۔ تمہارے لئے بس یہی ایک راستہ ہے' باقی تو ساری کی ساری صرف آگہی ہے۔ اسلام' ہم کہتے ہیں کہ ایک طرزِ زندگی ہے۔ طرزِ زندگی تو تبھی ہوتا کہ جب زندگی ہوتی۔ تو یہ جو ہماری زندگی ہے اور اسے گزارنے کا طریقہ ہے' اس کے علاوہ جو سارے کا

سارا کائنات میں ہے' یہ سارے کا سارا خالق اور اس کا حسنِ تخلیق ہے اور میرا ایمان اس بات پر ہے۔ اب اس میں شیطان بھی ہے' کفر بھی ہے' میں کیسے سارے کے سارے کو اسلام میں سمو دوں۔ پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ ما خلقت ھٰذا باطلا "ہم نے یہ باطل نہیں تخلیق فرمایا" یعنی یہ سب کچھ باطل نہیں ہے۔ اس لیئے میں اس تخلیق کی صداقت کا ماننے والا ہونے کی حیثیت سے کہوں گا کہ تبارک اللہ احسن الخالقین سبحان اللہ! جو بھی تخلیق فرمایا' میرا دشمن بھی' میرا نہ ماننے والا بھی' سب تیری تخلیق ہے۔ اس لئے میں مخلوق میں سے کسی چیز سے نفرت نہیں کروں گا کیونکہ یہ میرے خالق کا عمل ہے اور میرا خالق کرتا کیا ہے' انسان ہی تو پیدا کرتا ہے اور کون سے انسان؟ وہ جو مجھے پسند نہیں ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جس سے مجھے محبت ہے اس کی ہر چیز سے مجھے محبت ہوگی تو خدا کی تخلیق سے نفرت کرنے والا کبھی اپنے دعووں میں سچا نہیں ہوسکتا' اس لئے کہ میرا خالق ایک عمل کرتا ہے اور وہ عمل ہے مخلوق کو پیدا کرنا۔ اس لیئے میں یہ کہوں گا کہ مالک' خدا' اللہ' وہ اللہ سارے کے سارے فنکشن کے ساتھ موجود ہے۔ اب یہاں کچھ لوگوں کے لیئے سوال پیدا ہوگا کہ موجود بنی نوع انسان ہی کو اللہ کیوں نہ کہہ دیں۔ اب کسی بھی چیز کو' جو مادی شکل میں ہے' ہم اللہ نہیں' فطرت کہہ دیں گے اور اللہ کو فاطر کہیں گے۔ تو جھگڑا کس بات کا ہے۔ یہ ساری کی ساری جو فطرت موجود ہے وہ اس کا فاطر ہے۔ میرے ساتھ اس کا رشتہ یہ ہے کہ وہ معبود ہے اور میں عابد ہوں۔ باقی ساری کائنات کے لیئے وہ خالق ہے اور میں اس کا سجدہ کرتا ہوں۔ اے اللہ میں تیرا

سجدہ کرتا ہوں' تو نے دشمنوں کو بھی پیدا فرمایا۔ دشمن تو میرا اندازِ فکر ہے
ناں ! اس کے تو وہ بندے ہیں۔ یہ تو میرے حسنِ سلوک کی کمی ہے یا
کوئی ہے جس وجہ سے وہ دشمن ہیں اور اگر میرا حسنِ سلوک موثر ہو
جائے تو پھر دشمن کون ہے۔ تو اس لئے یہ جو سب سے پہلے آپ نے
بات کی ہے کہ ہم تو ناموں کے حوالے سے نہیں بلکہ روح کے حوالے
سے بات کریں گے تو اصل چیز تو یہ روح ہی ہے' ہم صرف اسی کو مفرد
کہیں گے' نہ اس کی کوئی اولاد ہے' وہ "لم یلد" بھی ہے' اور "احد"
بھی ہے' اور یہ روح ہی ہے۔ اسی کے حوالے سے ہم کائنات کے
بارے میں گفتگو کرسکتے ہیں اور یہ اتنی بڑی وحدت ہے کہ "یہی وہ توحید
ہے کہ جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا" تو اس دنیا کے اندر کافر کی بات تو
الگ رہ گئی' آپس میں بھائی بھائی کو نہیں سمجھتا' دیواریں پڑی ہوتی ہیں
ایک دوسرے کے درمیان' عقل پر بھی اور دماغ پر بھی۔ مقصد یہ کہ اگر
یہ مان لیا جائے کہ میرا عقیدہ درست ہے اور تجھے بھی حق ہے اپنا عقیدہ
رکھنے کا تو پھر جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ آپ کو اگر مختلف درباروں میں جانے
کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ احترام کا یہ عالم ہے کہ سکھ بھی خواجہ
صاحبؒ اجمیر شریف کے مزار پر باقاعدہ حاضری دیتے ہیں اور وہاں انہوں
نے کبھی اس پر اتنا زور نہیں دیا کہ آنے سے پہلے اپنا لباس بدلو۔ وابستگی
تو خود ہی عادت بدل دیتی ہے۔ اگر میرے کہنے پر ایک شخص گناہ کی طرف
مائل ہو سکتا ہے تو کیا میرے عمل سے میرے دین کی طرف مائل نہیں
ہو سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ حسنِ سلوک ختم ہو گیا ہے۔ اگر یہ قائم ہو
جائے تو محسن کا عقیدہ ہی آپ کے عقیدے کے اوپر احسان ہے۔ محسن

نے احسان چھوڑ دیا' ماننے والوں نے ماننا چھوڑ دیا۔

نذیر ناجی:

اچھا ایک اور بات آپ بتائیں کہ کفرانِ نعمت کیا ہے' یہی ہمارا فرض ہے کہ اس کی نعمت کا شکر ادا کریں۔ ایک تو یہ کہ جو چیز مجھے مل گئی اس کا میں نے شکر ادا نہ کیا لیکن کیا اس کی تعریف اس سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں' میری زمینوں میں' میں اگر اپنے ملک کے حوالے سے کہوں تو زمینوں کے اندر پہاڑوں میں خزانے رکھے ہیں' عناصر فراہم کئے ہیں' میں سیاروں کا سفر کر سکتا ہوں' میں ان کی مدد سے انسان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں مہیا کر سکتا ہوں اور وہ میں نہیں کرتا تو کیا اسے بھی ہم کفرانِ نعمت نہیں کہیں گے؟

واصف علی واصف صاحب:

نعمت ایک ایسی صفت ہے جس پر آپ شکر ادا کرتے ہوں یعنی ہر وہ چیز جو آپ کو شکر ادا کرنے کو کہہ رہی ہے اس کو آپ نعمت کہیں گے۔ نعمت کا کفران کیا ہے اور شکر کیا؟ اگر جو بھی چیز صفت کی شکل میں میرے پاس موجود ہے' اس کو نعمت کہہ دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ دوسرا آدمی اس کو نعمت نہ سمجھے۔ تو اس لئے جو چیز مجھے اس کا شکر ادا کرنے پر مجبور کر رہی ہے میں اس کو نعمت کہوں گا۔ اب کفرانِ نعمت سے کیسے بچیں' میں یہ کہوں گا کہ وہ چیز جو دوسرے کے پاس موجود نہیں ہے اور میرے پاس ہے' وہ اس کی سروس پر خرچ ہو۔ جو چیز میرے پاس موجود ہے اور اس کے شکر کی میں نے چٹھی بھیج دی کہ اے اللہ تیرا شکر

ہے کہ تو نے یہ نعمت مجھے دی اور میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ تو آگے یہ ہونا چاہئے کہ یہ نعمت اب ان کے کام آئے جن کے پاس یہ نہیں ہے۔ اگر یہ نعمت پرائڈ بن جاتی ہے تو پھر وہ آزمائش ہے، نعمت نہیں ہے۔ یہاں خطرہ ہے۔ دولت ایک نعمت ہے، فضل ہے، اللہ جس پر فضل کرتا ہے اسے بے حساب دیتا ہے۔ یہ تو بہت ہی فضل کی بات ہے کہ کوئی ملک کا بادشاہ بھی ہو اور اسے دولت بھی ملے۔ دینے والے نے یہ کہا کہ یہ تیرے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔ اس لئے کہ وہ طاقت جس نے بچے ہلاک کر دیے وہ کیا نعمت ہو گی؟ یہاں نعمت عذاب بن جائے گی۔ سو فرعون کی عاقبت اور ہو گی اور موسیٰؑ جو کمزور ہیں، ان کو خدا نے نعمت دی نبوّت کی، کہ لوگوں کو فرعون کے قہر و غضب سے نجات دلاؤ۔ سو وہ آدمی جس کو نعمت ملی اور وہ اس کے ذریعے خوف پیدا کر رہا ہے، وہ نعمت اس کے لئے عذاب کا پیغام ہے۔ اگر نعمت محسن نہ ہو تو عذاب ہے۔ اگر آپ میرے دوست ہیں اور مجھے خوشیاں نہیں دیتے تو کم از کم میرے خوف کو تو دور کرو۔ اس لئے کہ اس کے دور ہونے تک مجھے چین نہیں آئے گا۔ کسی کو عافیت دینا بہتر ہے۔ تم کم از کم اس کو خوف سے مبرّا تو بناؤ۔ تو نعمت والے آدمی کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگ جن کے پاس وہ نعمت نہیں ہے ان کو اس خوف سے بچائے۔ اس نعمت کی وجہ سے اس کے پاس ایک طاقت ہے اور اسی طاقت کی وجہ سے دوسروں کو خوف ہے۔ یہ اسی کا کام ہے کہ اس کو دور کرے۔ اگر میں نعمت لوگوں کی فلاح پر خرچ کرنے کی، بجائے انہیں خوفزدہ کرنے کا ہتھیار بنالوں تو یہ کفرانِ نعمت ہے، اور اگر وہ نعمت میرے باقی کے انسانی وجود کی صفات کو مسخ کر رہی ہے تو

یہ عذاب بن جائے گا۔اب کائنات کے اندر سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ آپ زندہ رہو انسان ہونے کی حیثیّت سے' نہ کہ بیل کی طرح کہ ہم تو اس طرح کے ہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسان کی حیثیّت اختیار کر کے زندہ رہو۔

نذیر ناجی:

اس ضمن میں بھی اگر دیکھیں تو ہم یہ سوچیں گے۔ کہ کیا اللہ انسان پیدا کرتا ہے یا آدمی' تو میرا یہ خیال ہے کہ خدا آدمی پیدا کرتا ہے اور پھر آدمی جتنا علم اور عملِ تخلیق اپنے اندر پیدا کرے گا اتنا انسان بن جائے گا۔

واصف علی واصف صاحب:

اس میں ذرا فرق ہے' میں یہ کہوں گا کہ خود سے انسان نہیں بنا جاسکتا بلکہ پہلے سے بنے ہوئے کسی انسان سے سبق لے کر' روشنی لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اس میں آگے بہت مباحث ہیں' ہر انسان' ایک درجہ کا ہے' دنیا میں جتنے انسان ہیں اتنے ہی درجات ہیں اور کوئی بھی شخص دنیا میں کبھی کسی دوسرے آدمی سے مشابہ نہیں ہوا۔ مثلاً" کوئی پیغمبر کسی پیغمبر کے برابر نہیں ہوا' کسی کا فنکشن کچھ اور' کسی کا کچھ اور ہے۔ غور کریں کہ پیغمبر کنویں میں گرے پڑے ہیں اور اللہ خود فرما رہا ہے کہ یہ میرے محبوب پیغمبر ہیں اور جب وہ یوسفؑ کنویں میں گرے تو درویش کہتے ہیں کہ آواز آئی "مبارک ہو پیغمبری سفر شروع ہو گیا"۔ تو پیغمبروں کی صفات الگ ہیں۔ اسی طرح درویشوں کے درجات اور صفات بھی

الگ ہیں۔ یہی ایک بات ہے غالباً" جس میں ایک راز ہے کہ جب اسلام بھی آگیا' دین بھی مکمل ہو گیا' پھر کسی اور نام کے دین میں شامل ہونے کی کیا ضرورت تھی' دین کے حوالے سے رسول اکرم ﷺ کے بعد نام کیوں آئے' خواہ طریقت ہو یا شریعت' اگر یہ بات سمجھ میں نہ آئے تو شرک ہے اور آ جائے تو عین عبادت ہے کہ ہر آدمی جس کا رزق آرہا ہے اس کا ایک فنکشن ہے کہ اس دور میں اس عقیدے کو وہاں سے جہاں بات پھنس جاتی ہے۔ باقی عبادت تو ایک جنرل سی بات ہے' دس آدمی ایک جگہ پر ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ رزق بھی ایک ہے لیکن پھر بھی ایک سے نہیں ہو سکتے' اس کا تعلق ضرور ہے' مجاہدے سے' غور سے' فکر سے' اس میں ترقی ہو جائے گی' لیکن یہاں بزرگوں نے ایک بات کہی ہے کہ مجاہدہ بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن خبردار! یاد رکھنا! کوشش سے گدھا کبھی گھوڑا نہیں بنے گا' اس لئے اس کی ایک حد ہے' ایک درجہ ہے' جہاں سے وہ آگے نہیں جاسکتا۔

نذیر ناجی:

اس کی ایک سائنسی توجیہہ بھی کرتے ہیں سائنس دان حضرات' کہ آپ داخلی کیفیت سے ایک خارجی عمل کو بدل نہیں سکتے یعنی آپ ایک انڈے کے گرد وہ حالات پیدا کر دیں تو اس میں سے بچہ نکل آئے گا۔ لیکن ایک پتھر کو اتنی گرمائی یا ویسے حالات دیں تو کچھ نہیں نکلے گا۔ تو یہی چیز ہے کہ اس کے اندر وہ جوہر ہونا چاہئے اور صرف کوشش سے اس کے اندر تبدیلی نہ آئے گی جو اس کے درجات میں اضافہ کرے گی۔ اسی طرح سے یہ لوگ جن کو ہم کہتے ہیں کہ دنیاوی لوگ ہیں' ہم سے

مراد وہ لوگ ہیں جو دین کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں' سو ان کے نزدیک ایسے لوگ کوئی روحانی عمل نہیں کر رہے' میری مراد سائنس دانوں سے یا دوسرے تاریخ ساز لوگ جو ہیں۔ یعنی معاشرے کے سائنس دان ایسے لوگ جیسے آئن سٹائن وغیرہ ہیں تو ان لوگوں کا عمل دراصل صداقت کی تلاش ہی کا عمل ہے یا مسافت کو اظہار کی شکل دینے کے لئے یہ جو کچھ کرتے ہیں میرے خیال میں تو وہ بھی روحانی ہی ہے۔

واصف علی واصف صاحب:

یہ بات بڑی آسانی سے واضح ہو جاتی ہے جب ہم دیکھیں کہ سورج کا کام کیا ہے' روشنی دینا۔ مسلمانوں کا سورج مسلمان ہے۔ کافر کا سورج پتہ نہیں کیا ہو۔ مقصد یہ کہ جو چیز کائنات میں اپنا فنکشن پوری دیانتداری کے ساتھ انجام دے رہی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔ سورج روشنی دینا چھوڑ دے تو ظلم ہوگا۔ سائنس دان سائنس کرنا چھوڑ دیں تو یہ ظلم ہوگا' میرا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ میں سائنس کو کفر کہہ کے چھوڑ دوں یا شرک سوچنا چھوڑ دوں' میں تو سورج' چاند' ستاروں' پہاڑوں' سمندروں کو اللہ کے حسن سے اور اللہ کے اسم سے' اس کے فضل کے حوالے سے مانتا ہوں۔ تو سائنس دان جو انسانیت کی خدمت کرنے والا ہے وہ انسان کو ماننے والا ہے اور انسان کو ماننے والا خدا کا منکر نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ شاید میرے اسلام کو نہ مانے یا میں اسلام کے حوالے سے اس کو نہ مانوں لیکن توحید کے حوالے سے وہ اتنا ہی حقیقت میں ہے جتنا میں ہوں۔ حقیقت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہاں تو باطل ہے ہی کچھ نہیں۔ ایک یہودی ایک بزرگ کے پاس جاتا تھا۔ اس کو کسی نے کہا کہ

بھائی تو وہاں جاتا ہے تو مسلمان ہی ہو جا۔ اس نے کہا کہ اگر تو اسلام وہ ہے جو تیرے والا ہے تو وہ تو میرے کام کا نہیں اور اگر بزرگ والا ہے تو میں اس کے قابل کہاں۔ تو اسی طرح سے جو اسلام اصل میں ہے وہ لوگ اس کے قابل نہیں اور جو ہمارے والا ہے اس کی انہیں ضرورت نہیں۔ تو حقیقت کے حوالے سے یہ دیکھیں کہ ہم انہیں باطل کیسے کہیں کہ ہم انہیں کون سا سچائی کا پیغام دے رہے ہیں۔ تو جن لوگوں کا آپ نے نام لیا وہ یقیناً بڑے لوگ ہیں۔ بس آدمی کو انسانوں کا مسئلہ نہیں ہونا چاہئے' انسان کُش نہیں ہونا چاہئے' انسانوں کی خدمت کرنے والا میرے خیال میں ویسا ہی ہے جیسے اللہ کے گھر کی خدمت کرنے والا۔

نذیر ناجی:

اب ذرا رحمت کی بات بتائیے کہ رحمت کی امید کیا کسی عمل کے پھل کی صورت میں کرنی چاہئے یا بیٹھے بٹھائے ہی کرنی چاہئے؟

واصف علی واصف صاحب:

دیکھئے۔ اگر علم کو عمل کہہ لیں تو بات علم کے نتیجے کے طور پر کرنی چاہئے۔ علم یہ ہے کہ فرمایا فرمانے والے نے کہ میری رحمت میرے غضب سے وسیع تر ہے۔ اب یہ بڑا نقطہ ہے۔ غضب کیسے کرے خالق مخلوق پر' پھر یہ تو تباہی ہو جائے گی۔ فرمایا کہ ہم آپ کو ایک ایسے وقت کی خبر دے رہے ہیں جب تم اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھو گے۔ اگر اعمال کا نتیجہ اللہ کریم ہمیں دکھائے تو یہ غضب ہے اور اللہ غضب نہیں کرتا۔ میں انصاف کی بات نہیں کر رہا۔ اس کی رحمت اس کے غضب

سے وسیع تر ہے اور رحمت کو یہاں ہم تجسیم مانیں گے کہ رحمت کو مجسّم رحمت بنا کر اللہ نے رسول اکرم ﷺ کو بھیجا۔ اب اگر اس کے بعد کسی شخص کو توبہ کا لفظ مل گیا اور پھر بھی اس نے گناہ کیا تو اس کی قسمت کی کمی ہے۔ توبہ کے بعد گناہ ہے۔ ہمیں تو بس اپنے اعمال سے توبہ کی ضرورت ہے۔ میں تو بلکہ ریاکار سے کہوں گا نیکی سے بھی توبہ کر لو' بدی سے بھی۔ ہمارے لئے تو رسول کریم ﷺ کی محبت ہی بہت ہے۔

نذیر ناجی:

یعنی ہم جیسے لوگوں کو اللہ سے انصاف نہیں رحمت مانگنی چاہئے انصاف مانگ بیٹھے تو مارے جائیں گے۔

واصف علی واصف صاحب:

یہاں میں ایک چھوٹی سی بات کی وضاحت کر دوں کہ اگر آپ اپنی ذات کو دیکھیں تو اسے سچا مانیں' اگر آپ نے اپنے سے کم درجے والے کو اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود معاف فرما دیا تو آپ معافی کے حق دار ہو گئے۔ یہاں کسی کی اگر آپ نے گرفت کر دی اور اس کی غلطیوں کی اگر سزا ہی ٹھہری تو پھر اپنی غلطیوں کو بھی گنو۔ یہاں میں معاف کر دیتا ہوں' اپنے دوست کو بھی اور دشمن کو بھی۔ تو میری تربیت مجھے یہ بتاتی ہے کہ میرے لئے معافی ہے اور جس ذات پر اللہ اور اس کے فرشتے درود ہی بھیجتے چلے جا رہے ہیں' اس ذاتِ مقدّس کا لقب رحمتہ اللعالمینؐ ہے اور رحمت کا طلب گار لازمی طور پر اس مجسّم رحمت کے

تقرّب کا خواہاں ہوگا۔ یعنی ہمارے اعمال کی عاقبت پر رحمت عالمؐ کی شفاعت بھاری ہے۔ تو جتنا رجوع ہم کریں گے رحمت کے باب میں، میں عمل نہیں کہہ رہا، عمل اگر کریں تو پھر تو کیا ہی بات ہے۔ لیکن اگر صرف رحمت کے باب میں رجوع ہی کرلیں تو یہاں ایک بات اور آجائے گی کہ اپنے گناہوں پر جس وقت انسان نے توبہ کرلی تو قبولیت کی دلیل یہ ہے کہ ایک تو وہ گناہ سرزد نہیں ہوگا، دوسرے وہ یاد نہیں رہے گا۔ اب رحمت کے بعد اپنے آپ کو اندیشے میں رکھنا زیادتی ہے۔ اس لئے اللہ کریم ہماری توقعات کے مطابق ہم سے سلوک کرے گا۔ اگر آپ اندیشے ساتھ لے جائیں گے تو میں منع کر رہا ہوں کہ اندیشے نہ رکھو۔ اگر امید لے کر جاؤ تو گے بار بار ارشاد ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ اکثر لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا، اس سے مراد یہ ہے کہ تو اپنے مستقبل سے مایوس نہ ہو، خدا کے لئے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔
تو اپنے دشمنوں کو ان کی عدم موجودگی میں معاف کر دو اور عدم موجودگی میں ان سے معافی مانگ لو۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں ایک بات اور کہ جو شخص آپ سے یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ ناراض ہے، اس میں راز یہ ہے کہ وہ بندہ آپ سے ناراض ہے، اس کو خوش کرو۔ اللہ کی ناراضگی کی اطلاع کدھر سے آئی ہے، یہ دیکھو۔ ناراضگی کا تو پتہ چل جائے گا کہ اس پر ہے کہ مجھ پر ہے۔ تو اللہ کی ناراضگی کو صفات کے حوالے سے اگر مان رہے ہو تو یہ سنو کہ اللہ کیا کہتا ہے۔
"ہم ظلمات سے نور میں داخل کرتے ہیں" کسے؟ مجھے! "ہم ان کی سیئات کو حسنات میں بدلتے ہیں" کس کی؟ میری! "ہم ہیں معاف کر

دینے والے' ہماری رحمت سے تم مایوس نہ ہونا' ہماری رحمت ہمارے غضب سے وسیع ہے"'' کس کے لیئے؟ ہمارے لئے! تو اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی اگر اندیشہ قبل از اسلام رہ گیا تو پھر بڑے افسوس کی بات ہے اسلام نے اندیشے ہی تو دور کئے ہیں۔ تو پھر قصہ کیا ہوا؟ اللہ کریم کے باب میں تو شک ہی نہیں کرنا چاہئے کہ غضب ہوگا ہم پر۔ اس کی رحمت ہمارے لئے موجود ہے' رحمت کرو اور رحمت حاصل کرو' توبہ کرو اور گناہوں کو بھول جاؤ۔

نذیر ناجی:

افراد کی دنیا کی طرف آتے ہوئے میں پنجابی کے ایک محاورے سے ابتدا کروں گا۔ کہ " ہتھ کار ولے تے دل یار ولے "۔ اس سے عمل اور عقیدے دونوں کا توازن ہے۔ ایک تو ہمارے ہاں خیال یہ پایا جاتا ہے کہ اگر آپ زیادہ رجحان دین یا روحانیت کی طرف کر لیتے ہیں تو ہم دنیاوی امور سے یعنی مادے کی مختلف تشکیلات یا تسخیر کائنات کے عمل سے اپنے آپ کو الگ کر لیتے ہیں جو ہمارے مشرق کا جہاں تمام مذاہب نے جنم لیا' کا بنیادی مسئلہ ہے کہ خواہ وہ اسلام ہو' بدھ مت' عیسائیت یا ہندومت۔ ان تمام مذاہب میں ان کے ماننے والے ایک مخصوص طبقے یا گروہ نے جو مذہب کو پیشہ بنا بیٹھا' انسان کو اسی فرض سے الگ کر دیا جو تسخیر کائنات کی شکل میں اس پر عائد کیا گیا تھا۔ اس کی مثالیں ہم دیکھتے ہیں کہ جن ملکوں نے ترقی کی انہوں نے مختلف شکلوں میں ان مذہبی لوگوں سے باقاعدہ جنگیں لڑ کے اپنے اس تخلیقی عمل کو آگے بڑھایا۔ مغرب نے عیسائیت کے خلاف' جن کو جمہوری ملک کہتے

ہیں اور پھر کمیونسٹ ملکوں میں بھی اپنے انداز میں' لیکن جب تک وہ ایک مخصوص مذہبی گروہ پر فتح نہ حاصل کر پائے اس وقت تک ان کی ترقی ممکن نہ ہوئی اور پھر وہ ہم سے آگے نکل گئے اور آگے نکلنے میں وہ یہاں تک پہنچے کہ میں سمجھتا ہوں کہ جو ہمارا فرض ہونا چاہئے' جو دین اسلام کے ماننے والوں کا فرض ہونا چاہئے کہ تسخیرِ کائنات کے عمل میں سب سے آگے جانکلیں اور ہم پیچھے رہ گئے۔ تو ہم ان حالات میں جن میں ہم پھنسے ہوئے ہیں اور اس مادی غلبے کی وجہ سے آج ہم ایک ایسے غلام کی مانند ہیں جو زنجیروں کی بجائے ایک نظام میں بندھے ہیں اور ہمارے اختیار و عمل کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے بلکہ ہمارے لئے جو شعبے متعین کئے جاتے ہیں وہ بھی ان کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اس سے نکلنے کے لئے ہمیں اب کیا کرنا پڑے گا۔

واصف علی واصف صاحب:

یہ جو آپ نے سوال کیا کہ ہم غیر دینی یا غیر مذہبی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں' اس میں ہمارا دین ہمیں کیا راہ دکھاتا ہے۔ جب ہم لفظ "ہم" کہہ رہے ہیں تو جس زمانے میں ہم تھے وہ زمانہ بھی ہمارا تھا اب تو میں ہوں یا تم ہو' "ہم" تو ہیں ہی نہیں۔ تو جب تک مل کر میں اور تم "ہم" نہیں بنتے ہمارا دین بھی گمراہی ہے اور دنیا بھی۔ جماعت لٹ گئی ہماری' آپ ہماری دعائیں دیکھیں' سب جمع کے صیغے ہیں' تو جمع کہیں ہوتا ہی نہیں' تو جب آپس ہی میں "میں" تقسیم ہو گیا تو پھر وہ سارے کا سارا فیض کا جو باب تھا' وہ ختم ہو گیا۔ تو پھر ہمارا مذہبی انداز فکر اب ہمیں نہیں بچاتا۔ ہمیں بچایا تھا ہمیشہ دین نے اور اسی میں اگر

Religious Professionalism آجائے تو پھر فیض کہاں سے آئے گا۔ اس کی تو ضرورت ہی اور ہے۔ اس ضمن میں، میں یہ کہوں گا کہ اگر آدمی صادق نہ ہو تو صداقت بیان نہیں کرسکتا جھوٹا آدمی کلام ایسے ہی بیان کرے گا تو اثر نہیں ہو گا۔ یضل بہٖ کثیرا ویھدی بہٖ کثیرا تم اگر تقویٰ نہ کرو تو تمہارے لئے ہدایت ہی نہیں ہے۔ ہمارے پاس ہدایت صرف متقی کے لئے ہے۔ تو یہ جو بنیادی ضرورت ہے وہ تو ہمارے پاس رہ نہیں گئی، اب ان واقعات سے جن کی زنجیریں نہیں ہیں لیکن افکار کے ہم غلام ہیں تو بات وہی ہے کہ ہم اپنی نااہلی، نااتفاقی اور ناعاقبت اندیشی کو غلطی سے اپنے دین کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور اس طرح ہم کسی طور یہ چاہتے ہیں کہ دین کے نظام سے آزاد ہونے کی طرف رجوع کیا جائے اور اس کا جواز یہ دیتے ہیں کہ اس سے ترقی ہوگی تو اس کاجواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ فرعون کی ترقی اور موسیٰؑ کی پسماندگی ہمارے لئے ایک مختلف نتیجہ برآمد کرتی ہے۔ اس لئے یہاں ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی اور زندگی کے ارتقاء کو جس ترقی کے حوالے سے پہچاننا چاہتے ہیں اس حوالے میں دین اور الٰہیات کی شمولیت ضروری ہے ورنہ یہ ترقی ایک طاغوت اور گمراہی کہلائے گی۔ اللہ کے منکرین اور اس کے دین کے منکرین جس ترقی کی نشاندہی کر رہے ہیں وہ ہمیں اس قیمت پر قابل قبول نہیں اور ویسے بھی غور کیا جائے تو گھوارے سے لے کر اپنے مزار تک زندگی کے چند گنے ہوئے برسوں کے لئے انسان کو کتنی ترقی درکار ہے اور اگر اور غور کیا جائے تو یہ دیکھیں کہ ترقی نے انسان کو کون سی آسانی دی ہے، آج کا انسان اور ترقی یافتہ انسان دنیا

کو ایک ایسے اندیشے میں مبتلا کر رہا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ آسمان کے دروازے کھٹکھٹانے والا انسان دل کے دروازے پر دستک دینے سے محروم ہے' زندگی آج بھی اسی کرب مسلسل میں گرفتار ہے۔ ترقی کا حال تو یہ ہے کہ یہ ایک جہاز کی مانند ہے جو سمندر میں محفوظ سفر کر سکتا ہے لیکن اسے معلوم نہیں کہ اس نے جانا کہاں ہے۔ ترقی کی منزل مقصود نامعلوم ہو تو یہ ترقی ایک بے کار اور رائیگاں کوشش ہے۔ انسان' انسان کے کام نہ آیا۔ ترقی یافتہ قوموں نے پسماندہ اور ترقی پذیر قوموں کو کوئی رہنمائی نہیں دی۔ آج دنیا کے اندر جتنے اندیشے موجود ہیں اس سے پہلے دنیا میں اتنا خوف نہیں تھا۔ امن کے نام پر جنگ کی تیاری کرنے والی ترقی انسان کو کس منزل کی طرف لے کے جا رہی ہے۔ غالباً" اس کا انجام مکمل طور پر تباہی ہو گا۔ دوائیاں اور علاج کے طریقے بڑھتے جا رہے ہیں اور بیماریاں اتنی ہی پیچیدہ ہوتی جا رہی ہیں۔ زندگی پچاس سال سے آگے ٹھہرتی نہیں' تو ترقی نے انسان کو کیا دیا' آج کسی کو کسی پر اعتماد نہیں۔ صاحبِ اقتدار نے اقدار تباہ کر دیں اور آج کا انسان حیران و پریشان ہے کہ ترقی کے چرچے ہیں لیکن آدمی بربریت کا نشانہ ہے' انسان ویسے کا ویسا ظالم اور جاہل نظر آتا ہے۔ آج کی ترقی دنیا کو خوف زدہ کر کے اس پر قبضہ کرنے کی خواہش مند ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا اور دنیا کی تہذیب اور دنیا کی زندگی ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہے اور نہ جانے کب کوئی ترقی یافتہ قوم کیا حرکت کر دے اور انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندگی سے محروم ہو جائے۔

نذیر ناجی:

آپ کی گفتگو سے ایک بات جو میں نے اخذ کی وہ یہ کہ قرآن پڑھنا ہو تو پہلے اس کی اہلیت ہونی چاہئے' تو اگر ہم اس کے اہل ہی نہیں ہیں تو پھر ہم کیا کریں گے؟

واصف علی واصف صاحب:

ایک آدمی آیا تو کہا گیا کہ کلمہ پڑھو تو پھر اس نے پوچھا کہ اب میں کیا کروں؟ فرمایا گیا کہ ہم جنگ پر جارہے ہیں' تو بھی چل' یا ہم امن میں ہیں سو تو بھی امن میں رہ' ہم کاروبار کر رہے ہیں تو بھی کاروبار کر۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ کتابیں پڑھو۔ اصل میں عمل کو ہم نے علم بنا لیا اور علم کو ہم نے بحث بنا لیا۔ تو نتیجہ یہ کہ جو مضبوط ہونے کا عمل ہے وہ ختم ہوگیا اور اس سے ایک بڑا نقصان ہو گیا۔ ایسا انسان جس کی ذات تمام لوگوں کے لئے قابلِ قبول ہو' وہی وحدتِ کردار دیتا ہے' وہی وحدتِ فکر دیتا ہے۔ ہمارے پاس وہ عہد ساز انسان نہیں رہا جیسے قائد اعظمؒ یا اقبالؒ تو ہماری لیڈر شپ بٹ گئی۔ کوئی ایک انسان اگر اتفاق سے کہیں سے آ جائے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو تو پھر دنیا بھی آپ کی محفوظ ہو گئی اور دین بھی۔ دس کروڑ مسلمان ہیں' آپ اندازہ لگایئے کہ دس کروڑ غلام مسلمان ایک ملک بناتے ہیں' آج پندرہ کروڑ آزاد مسلمان اندیشے میں ہیں۔ اب یہ اعجاز ہے کسی چہرے کا کہ کوئی ایک چہرہ طلوع ہو گیا تو بس سمجھو سارا کام ہوگیا اور باقی کرنے والا اب کوئی کام نہیں رہ گیا۔ بات اب اس سے آگے بڑھ گئی ہے۔ ہاں وہ جانتا ہے۔ وہ فضل فرمائے تو ہو

جائے گا کیونکہ سائنس میں اگر ہم یورپ سے یا دوسرے ملکوں سے مقابلہ کریں تو جو ایک سال ہم سے آگے ہیں وہ ایک سال ہی آگے رہیں گے جو ہزار سال آگے نکل گئی وہ قومیں ہزار سال ہی آگے رہیں گی' اب تو ہمیں کوئی شارٹ کٹ ملنا چاہئے۔ تو شارٹ کٹ ہمارے پاس یہی ہے کہ اگر کوئی فیض ہو جائے' کوئی فضل ہو جائے اور دشمن خود ہی ہمارا ہو جائے یا ہمارے سامنے جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں' یہ فنکشن تبدیل ہو جائے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم مقابلہ کرنا چاہتے ہیں' وہ فیلڈ ہی نہیں ہمارا' ہم کہتے ہیں کہ ہمارا فیلڈ ہے "السلام علیکم"۔ چلو کرو مقابلہ۔ اب جنگ کس بات کی! وہ تلوار لے کے آیا ہے اور میرے پاس چاقو بھی نہیں' مقابلہ کیا کروں۔ ہمارے پاس اس کی مثالیں ہیں کہ لوگ تلوار لے کے آئے' آپ ﷺ نے کہا السلام علیکم' تلوار ہاتھ سے گر پڑی' کہا مجھے کلمہ پڑھائیں۔ اسلام کی تو ابتداء ہی ایسے ہوئی۔ تلوار لے کر آنے والے کو سلام کر دیا تو تلوار ہاتھ سے گرے گی ضرور۔ مسئلہ یہ کہ سلامتی کا پیغام نہ میں نے بھائی کو دیا نہ پڑوسی کو' نتیجہ یہ کہ جو تبلیغ کرتے ہیں آج دنیا میں' اگر وہ لوگ ہم سے پوچھتے ہیں کہ جو دین تم ہمیں اپنانے کو کہہ رہے ہو اس کا کون سا معاشرہ قائم کیا ہے تم لوگوں نے آج کل' تو پھر ساری تبلیغیں رک جائیں گی' اس لئے پہلے معاشرہ قائم کر لیا جائے۔ ہمارے پاس ایسے علم کی کمی نہیں ہے۔ تو یہ علم ہمارے معاشرے کی اصلاح کے لئے بہت ہے اور پھر اس کے بعد ہمیں دنیا کی اصلاح کے لئے نکلنا چاہئے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ پہلے وحدتِ عمل پیدا ہو اور کچھ نہیں تو وحدتِ علم تو پیدا ہو جائے۔ جہاں تک ہم

اتفاق کرتے ہیں وہیں تک علم رکھا جائے تو شاید وحدتِ عمل بھی پیدا ہو جائے۔ ایک آدمی نے کہا کہ آپ نے وہ کتاب پڑھی' اس نے فوراً جواب دیا " میں نے دوسری پڑھ لی ہے"۔ اب جس نے دوسری کتاب پڑھی ہے اس پر آپ کی کتاب کے علم کا کیسے اثر ہو' تو آپ کتابوں کے اوپر کتابیں لا رہے ہیں تاکہ کسی طور دوسرے پر برتری ہو' تو خدا کے لئے علم کو کتابوں سے باہر نکالو یا کتابوں کو علم سے الگ کرو۔ پہلے یہ جو زندگی پاس سے گزر رہی ہے یہ حقیقی علم ہے' اس کو دیکھو۔ ایک آدمی بیمار ہے تو اسے کلمہ بعد میں پڑھانا پہلے اس کو دوائی دو۔ سمندر میں کوئی ڈوب رہا ہے تو بجائے اس کے کہ اس سے اس کے قبیلے یا فرقے کے بارے میں پوچھو اس کو بچانے کی فکر کرو۔ ہمیں حقوق اللہ پتہ ہے تو کیا وجہ اللہ کا بھی پتہ ہے؟۔ ہمیں اللہ کے تمام اسماء کا پتہ ہے۔ صرف وجہ اللہ کا نہیں جب وہ ارشاد فرماتا ہے' جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو چہرہ ہمارا ہی ہے تو پھر ہم کیوں غور نہیں کرتے۔ یہ سارا چہرہ اس کا ہے۔ ؎

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا

جیسے آپ نے کہا ہے کہ " ہتھ کار ولے تے دل یار ولے " تو اس سے بھی اگلی بات خواجہ غلام فریدؒ صاحب نے فرما دی کہ۔ ؎

خلقت کوں جیندی گول اے
ہر دم فریدؔ دے کول اے

بے ضرر ہونے سے سفر شروع ہوتا ہے اور منفعت بخشی پر ختم ہوتا ہے

تب انسان مکمل ہے' سب جہاں بھی اس پر راضی اور اس کا مالک بھی۔
اس لیئے یہ سارے واقعات صحیح ہو جائیں گے جب تک ہم آپس میں
مربوط نہیں ہوتے یہ مسئلہ یونہی رہے گا۔ اس کی آسان سی بات یہ ہے
کہ خدا کے لیئے خدا کے بارے میں بحث کرنی بند کر دی جائے۔ اگر اللہ
ہے! تو وہ جانے' نہیں ہے! تو وہ جانے۔ ہم مانتے ہیں تو تو ہمارا احترام کر
کہ میں خدا کو مانتا ہوں لہٰذا خدا کے خلاف بات نہ کر۔ تو نہیں مانتا تو تیرا
عقیدہ ہے میں اس کے خلاف بات نہیں کرتا۔ ایک دوسرے کے
عقیدے کا احترام کر کے خدا کے بارے میں بحث بند کر دی جائے'
خدمتِ انسانیّت کا حوالہ دیا جائے' میرا خیال ہے کہ شاید ہم مربوط ہو
جائیں۔ اس باب میں داخل ہی نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں کتنی شقیں
ہیں یا فلاں مقام پر کیا واقعہ ہوا۔ انسان کو کیا کرنا چاہیئے۔ انسان ہے کیا'
پہلے تو اس کو پہچانو۔ ٹریجڈی تو یہ ہے کہ پہچان ہی بھول گئی ہے۔ کربلا کا
واقعہ ہے کہ امامِ عالی مقامؑ نے فرمایا کہ یہ تو پہچانو کہ کل تک تم نے مجھے
دیکھا ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر' شکل بھی تم بھول گئے
اور واقعات تو جانے دو کہ کیا ہیں' تم تو انسان کا چہرہ ہی بھول گئے۔ تو
افسوس اسی بات کا ہونا چاہیئے کہ ہم تو چہرہ بھی بھولتے جا رہے ہیں۔ اللہ
اپنا کرم کرے' کتابوں کے علوم تو بند ہوگئے ہیں' چہروں کے علوم بچ
جائیں۔ چہروں کا علم قائم رہنا چاہیئے' وفا کا علم قائم رہنا چاہیئے' خدمت کا
علم قائم رہنا چاہیئے۔ میری عبادت تو اس اللہ کے لیئے ہے جس نے اسے
بھی پیدا کیا ہے جو مجھے نہیں مانتا۔ تو اس کے لیئے بھی دعا کرو۔

نذیر ناجی:

آپ نے گفتگو میں سچ اور جھوٹ کا بڑا ذکر کیا ہے' میں اس میں ذرا الجھا ہوا ہوں۔ تو یہ سچائی اور جھوٹ کیا ہے؟

واصف علی واصف صاحب:

یہ سچ اور جھوٹ اضافی ہے نہ مطلق۔ سچ اور جھوٹ یہ ہے کہ اس کائنات کے اندر اگر ہونے کو سچ کہا جائے تو نہ ہونے کو ہم جھوٹ کہیں گے۔ کیونکہ ہم ہونے کی دنیا میں جا رہے ہیں۔ اس عقیدے کے علاوہ جتنے بھی ہیں ان کو ہم جھوٹ کہیں گے۔ حالانکہ وہ اپنی دنیا کے سچے ہیں۔ ان کا اپنا دین ہے' اپنا فیلڈ ہے' اپنے سچ ہیں' اپنی حدود ہیں' پہچان کے اپنے ذریعے ہیں' بات یہ ہے کہ ہم سچ تلاش نہیں کر سکتے۔ سچ نہ مطلق حالت میں ملے گا نہ قوس حالت میں اور نہ کسی دوسری حالت میں' ہمیں تو صرف سچا انسان ہی مل سکتا ہے سچ نہیں ملے گا۔ جس طرح ہمیں حسن نہیں ملے گا' کوئی حسین ملے گا۔ اب جہاں سچا مل گیا اب ضروری نہیں کہ وہ سارا ہی سچا ہو۔ مطلب یہ کہ میں نے اس کو سچا مان لیا' اس کے بعد اس کا جھوٹ بھی میرے لیئے سچ ہے۔ بات اس صداقت کی ہے تو صداقت کی میں تعریف یہ کروں گا کہ صادق کا قول ہی صداقت ہے۔ صادق نے جو فرمایا وہ صداقت ہے اور صادق کو ماننے کے بعد اس کی صداقت کی تصدیق مجھے منافق بنا دے گی۔ اب صداقت کا بیان اسی پر چھوڑ دو جو اپنی صداقت بھی جانتا ہے اور میری بھی۔ اسی میں اس کا راز ہے۔ ہم نے اگر خدا کو تلاش میں ڈھونڈا ہوتا کہیں تجربے سے خدا ملتا تو پھر اتنا جھگڑا کاہے کو ہوتا۔ وہ تو ہمیں جیسے ملا' صادق کے حوالے سے

ملا۔ توحید مفرد تو ہماری ہے ہی نہیں۔ وہ تو صرف شیطان کے پاس ہے۔
ہماری تو توحید بڑی کھری ہے کہ اللہ اور اس کا حبیب ﷺ۔
ان میں سے ایک نہ ہو تو ہمارا اسلام نہیں رہتا۔ اللہ کو مان لیا جائے اور
رسول پاک ﷺ کو نکال دیا جائے تو ہم مسلمان نہیں رہتے۔
ہمارے لئے تو یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ اللہ کے بارے میں ہمیں
وضاحتیں فرما رہے ہیں اور اللہ کریم رسول پاک ﷺ کے بارے
میں ہمیں وضاحتیں فرما رہے ہیں۔ وہ دونوں جانیں' ہم دونوں کو مانتے
ہیں اور دونوں کو دونوں کے حوالے سے جانتے ہیں۔ اس لئے سچ وہ ہے
جو سچا کہے اور سچا آدمی اگر جھوٹ بول دے تو اسے ہم مصلحت کہتے
ہیں۔ جھوٹا آدمی اگر سچ بول رہا ہو تو اسے ہم منافقت کہتے ہیں۔ جھوٹے
نے سچ بولا تو سوچو' خطرہ ہے۔ اتنا جھوٹا آدمی سچ کیسے بول گیا۔ سچا آدمی
اگر سچ نہیں بتا رہا تو اس کی مصلحت کو پہچانو کہ اس میں کوئی راز ہو گا۔
شاید وہ کوئی اصل سٹیٹ سیکرٹ نہ دینا چاہے۔ اب جو ہمارے سچے دین کا
ابلاغ نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت دینے والے سچے نہیں
ہیں' وہ انسان جو دین کا سچ پیش کر رہا ہے اور اپنی سچائی نہیں پیش کر رہا
تو اب اس میں ہم کیا کہیں۔ کردار کے اندر اگر سچائی نہیں تو زبان کی
سچائی کیسے اثر کرے۔

نذیر ناجی:

یہ زندگی جو آپ نے گذاری ہے کیا اس میں کبھی آپ کو کوئی
مسلمان ملا؟

واصف علی واصف صاحب:

میں ہر آدمی کو مسلمان مانتا ہوں اور میں ہر ایک کی خیر کی بات کرتا ہوں۔ مجھے مسلمان کی درجہ بندیاں پسند نہیں ہیں۔ چھوٹا مسلمان' بڑا مسلمان' کلمہ پڑھنے والا' ماننے والا مسلمان ہے۔ میرا عمل اس کے ساتھ نیکی کا ہونا چاہئے۔ میں وضاحت نہیں چاہتا۔ کسی سے جس نے غلطی سے بھی مسلمان کہہ دیا اپنے آپ کو' اب آپ اسے Accomodate کرو۔

نذیر ناجی:

اگر یہ بات ہے کہ سارے مسلمان ہیں تو پھر اسلام کیوں نظر نہیں آتا؟

واصف علی واصف صاحب:

یہ شعبہ کس کا ہے۔ اس میں صرف ایک آدمی کی آپ کے شعور کے اظہار کے انداز کے خلاف یہ بات چلی گئی ہے۔ یہی جو سوال آپ نے کیا اسی سوال کو اگر آپ زندگی کا مقصد بنا لیں کہ مسلمان تو اتنے سارے ہیں پھر اسلام کیوں نظر نہیں آتا' تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ ہم نے وضاحتوں کا نام اسلام رکھا ہوا ہے۔ مسلمان کو ہی اسلام کہو۔ میں تو یہ کہوں گا کہ مسلمانوں کا عمل ہی اسلام ہے۔ کیوں کہ وہاں تو عمل اتنا سا ہے کہ اللہ ہے اس کے حبیب ﷺ ہیں' قرآن ہے' تفسیر کے بغیر' تفسیر تمہاری مراد ہے' الہام پیش ہو رہا ہے' وحی پیش ہو رہی ہے' وحی کو سمجھنے والا کم از کم الہام تو رکھتا ہو اور اگر رکھتا ہے تو

جواب سمجھ لیں کہ کیا ہے یعنی کہ تفسیر تو چھوڑ دیں۔ کلام موجود ہو' مصحف پاس بیٹھا ہو تو فیض ہی عطا کر دے گا۔ میں نے لوگوں کو صرف بسم اللہ کا قرآن پڑھتے دیکھا ہے اور وہ تفسیر جانتے ہیں اور اختلاف میں نہیں پڑتے۔ تو بس آپ یہ کرو کہ اللہ کو مانو' رسول اکرم ﷺ کو مانو' قرآن کو مانو اور ایک چیز اور کہ اپنی زندگی کو جان لو۔ اس لئے کہ آپ موجود ہو اور یہ موجودگی تھوڑی دیر کی ہے پھر نکل جانا ہے' اس کو مان لو۔ اب اگر آپ کے اسلام اور زندگی کے تقاضوں میں اختلاف ہوا تو پھر مسئلہ پیدا ہو گا اسلام کا منشاء ہمیں اور طرف لے جانا چاہتا ہے اور زندگی کا مدعا کچھ اور ہے۔ یہ تضاد ہے اس کو حل کرو۔ یہ دانشوروں کا کام ہے۔ اور جن کا عقیدہ درست ہے اور حالات درست نہیں ہیں خیال کے' تو اگر زندگی کا منشاء اور اسلام کا منشا ایک نہ ہو تو دراڑ پڑ جائے گی۔ اس منشاء کو ایک کرو۔ مسلمانوں کی وحدت کے اندر جو عمل ہو گا وہ اسلام ہو گا۔ اب ہندوستان کے مسلمانوں نے وحدت کے ساتھ ایک عمل کیا' پاکستان بنایا تو پھر پاکستان کی تخلیق اسلام ہے۔ پاکستان کو اگر نقصان پہنچا ہے تو آپ کیا کہو گے کہ اسلام کو نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کے وحدتِ عمل کا نتیجہ ہے۔ مسلمان جب بھی وحدتِ عمل میں آئیں گے بڑا کارنامہ انجام دیں گے۔

نذیر ناجی:

پھر اس میں رکاوٹ کیا ہے؟

واصف علی واصف صاحب :

یہ تو بڑی پرانی بات آپ نے کہی۔ مطلب یہ کہ جب مطلب اور ایثار میں تضاد آ جائے تو پھر یہی حشر ہوتا ہے۔ اگر میں اپنی ضرورت کو آپ کی ضرورت پر فوقیت دوں تو یہی نتیجہ نکلے گا لیکن اگر آنے والے کو اس کے جانے سے پہلے خدمت پیش کر دو تو ایسا نہیں ہو گا۔ آپ ذرا اس بات پر غور کریں کہ صبح سے شام تک آپ گھومتے ہیں بازاروں میں سڑکوں پر' گاڑیوں میں' گلیوں میں کہیں اسلام نظر آیا ہے آپ کو؟ گاڑی میری جاپان کی ہے' میں نے اسے کلمہ پڑھایا ہے' سڑک جس پر چل کر دفتر جاتا ہوں انگریز نے بنائی تھی۔ اسی طرح کی چیزیں ہیں تو ساری کی ساری فعالیّت ہے لیکن آپ کو اسلام نظر نہیں آیا۔ کہیں کوئی فنکشن الگ سے اسلام کے نام پر نہیں ہو رہا لیکن یہ جو ساری روز مرّہ کی فعالیّت ہے اسی کو اسلام بن جانے دو یہ جو آپ کر رہے ہو۔

نذیر ناجی :

کوئی ایسا نہیں جو دوسرے سے پوچھے کہ تم کس حال میں ہو؟

واصف علی واصف صاحب :

نہیں ! پوچھنے والے بہت ہیں۔ آپ نے جس سے پوچھا وہ دوسرے سے ضرور پوچھے گا۔ مجھے آسانی ملے گی تو میں دوسرے کو بھی آسانی دوں گا مجھے تنگ کیا جائے گا تو میں بھی تنگ کروں گا۔ ہماری دعا یہی ہونی چاہئے کہ اے خدا تو نے مجھے فیض دیا سو جن کے پاس نہیں ان کی خیر ہو۔ رزق کو تو بانٹ دیا' فیض میں بھی شامل کر لیا' تو چہرہ کون بانٹے

گا، شعور کون بانٹے گا۔ مطلب یہ کہ آپ کے اندر اتنی صفات ہیں جن کا کوئی شمار نہیں، آپ کیسے بانٹو گے۔ مطلب یہ کہ جو چیزیں ہم آسانی سے دے سکتے ہیں وہ تو دی جائیں معاشی طور پر رزق صرف یہ نہیں ہے کہ جیب میں پیسہ ہو۔ آنکھ کی بینائی رزق ہے، چہرہ رزق ہے، اولاد رزق ہے، ماں کی محبّت رزق ہے، تو رزق سارے تو نہیں ہم بانٹ رہے ہیں۔ یہاں یہ جو مادی چیز ہے پیسہ یہ تو ہمارے کام کی چیز ہی نہیں ہے۔ اس کا نام زندگی تو نہیں ہے ناں! دو اسے جس کے پاس نہیں ہے۔

نذیر ناجی:

ایک تو وہ دنیا ہے جو ہم سوچ رہے ہیں کہ ایسی ہونی چاہئے ایک وہ دنیا ہے کہ جو واقعی ہے۔ اب ایسی دنیا میں مثلاً" پاکستان، اگرچہ یہ چھوٹا سا حوالہ ہے لیکن ہم یہاں رہ رہے ہیں کہ ہم تو اپنے پڑوسیوں سے امن و سکون کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ دوسروں کے عمل سے متاثر ہو کر ہمیں اپنی پالیسی تبدیل کرنا پڑتی ہے۔ اس صورت حال میں جو آپ کا طریقۂ کار ہے کہ اگر دشمن تلوار لے کر آئے تو سلام کرو یہ کہاں تک قابلِ عمل ہے۔

واصف علی واصف صاحب:

مسئلہ یہ ہے کہ جو چیز خوف پیدا کر رہی ہے کہ دوسرے کا خیال یا عمل ہم پر گراں ہے، جو بوجھل ہے، ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ ہتھیار ہم نہیں بنا سکتے جو اس کے پاس ہیں۔ اس ہتھیار سے اس کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ سو اس کے علاوہ بھی کوئی

ہتھیار ہونا چاہئے اور وہ ہتھیار ہے۔ اس وقت مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں یہ پتہ ہے کہ زندگی ایک وقت کے بعد نہیں ٹھہرتی اور اس سے ضائع نہیں ہوتی اور بازوں اور لشکروں کی موجودگی میں چڑیا سلامت بھی رہ سکتی ہے اور وہ رہی ہے' تو یہ سارے خوف خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے مثبت رویے اپنائے جائیں تو ہم "ہم" بن جائیں۔

نذیر ناجی:

جناب یہ فرمائیے کہ حادثات جہاں سے گھبرا کر' فرض کیا کہ داتا صاحبؒ کے مزار پر جاتا ہوں تو مجھے وہاں سے کیا کچھ ملے گا؟

واصف علی واصف صاحب:

وہاں سے آپ کو فیض ملے گا۔

نذیر ناجی:

یہ فیض کیا ہے؟

واصف علی واصف صاحب:

ہر اسم کے ساتھ جو انسان' عزت کے ساتھ وابستہ ہے اس اسم کا مسمّٰی ہمہ حال اپنے اسم کی حفاظت میں ہے ہمیشہ جس کا بھی اسم ہے جیسے علیؑ ہے' ولی ہے' کوئی نام ہے یا علیؑ کیا ہے؟ میں تو محبّت میں کہہ رہا ہوں لیکن اس اسم کے تقدّس کے ساتھ میری وابستگی ہو گئی اور اس کا تقدّس محفوظ کرنا ہے۔ اس نے جس کا یہ اسم ہے اب وہ میری مشکل حل کرتا ہے یا مجھے فیض دیتا ہے تو اس کے نام کا تقدّس رہتا ہے ورنہ اسم کو بھی

حادثاتِ جہاں نے راہ نہ دی
آپ کا نام بھی لیا میں نے

تو پھر بات نہیں بنتی ناں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر آپ کسی اسم سے وابستہ ہیں تو وہ ذات ہمیشہ ہی اپنے اسم کی حفاظت میں فیض دیتی ہے۔

نذیر ناجی:

اور موجود ملتی ہے۔

واصف علی واصف صاحب:

اب یہ ذات کیسے ہوتی ہے؟ ذات موجود ملتی ہے اگر موجود کے معنی بالوجود ہیں تو میری خاموشی ہے۔ مقصد یہ کہ اس کی ہمہ رنگ موجودگی صفات کے ساتھ ہے' اعمال کے ساتھ ہے' واردات کے ساتھ ہے اور یہی اعمال اور یہی صفات اور یہی واردات ان کا شعور ہمیں کسی بزرگ کے فیض کی شکل میں حاصل ہوتا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں اپنے شعور کے ساتھ ہونے والے واقعات کو پہچاننے سے قاصر ہیں بلکہ ہم اپنی بغاوت سے بے خبر ہیں اور صفات سے بزرگ لوگ آشنا کرا کے ہمیں اس ذاتِ واحد کی صفات کے پرتو سے آشنا کراتے ہیں اور یہی ان کا فیض ہے۔

نذیر ناجی:

تو جیسے اسم پھر علامت ہی کے طور پر آتا ہے اور اصل میں تو وہ شخصیّت ہے جو یا علیؑ کے نامؑ سے میرے ذہن میں ہے ایک عمل ہے مسلسل یا ایک سوچ ہے۔ تو جیسے اسم سے یہ شکل آتی ہے اسی طرح

مظاہر سے بھی آتی ہے۔ تو میں مظاہر دیکھ کر بھی تو وہی مصنف کشف المحجوب کو پہچان سکتا ہوں کہ وہ ذات جو موجود تھی اب زیرِ زمین ہے۔

واصف علی واصف صاحب:

اس میں میں تھوڑا سا فرق رکھوں گا کہ عام حالات میں مجھے مزار کے قریب لے جانے والی میری خواہش ہوتی ہے۔ خواہش علم نہیں بلکہ ضرورت کی خواہش ہے۔ بارہا میری ضرورتیں آتی ہیں جو مجھے مجبور کرتی ہیں کہ میں تلاش کروں کسی انسان کو۔ اب اگر میری تلاش فانی ہے تو میں فنا کی سہولت لینا چاہتا ہوں اس مزار سے جس کے لئے وہ مجاز نہیں ہے، بابِ فنا میں سہولت لینا چاہتا ہوں۔ بابِ فنا میں تو مقام کے جمالیاتی سانچے کچھ نہیں کریں گے۔

نذیر ناجی:

لیکن دوسری طرف اگر مجھے محبت لے جا رہی ہے تو؟

واصف علی واصف صاحب:

پہلے ذرا خواہشات کے تابع آدمی کی بھی سُن لیں۔ ایک آدمی دعا کر رہا تھا تو اس نے جبرائیلؑ کو دیکھا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کون ہیں وہ بولے جبرائیلؑ! کہا کہ اچھا پھر میری دعا اللہ تک پہنچا دیں۔ کہا بولو۔ اس شخص نے اپنی فہرست گنوانی شروع کر دی وہ بولے بس کافی ہے۔ میں سمجھ گیا اور کہہ دوں گا اس نے کہا کہ حضرت کیا کہیں گے۔ تو بولے کہ میں کہوں گا کہ وہ شخص کہہ رہا ہے کہ اپنے علاوہ مجھے سب کچھ دے دو۔ ایسی دنیا میں تو اپنے علاوہ ہی آئے گا۔ البتہ یہ کہ اگر آپ کو محبت لے

چلی تو محبّت میں محبوب اگر آپ کے ذوقِ جمال میں واضح طور پر ابھرا ہے تو پھر یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیوں کہ یہ تو ایک امر اترا ہے یہ چاند ہے جو آپ کے آنگن میں اترا ہے۔ پھر وہ مزار نہیں ہے ذات ہے انسان کی محبت میں مزار نہیں اترتا۔ انسان کی محبّت میں خدا بھی نہیں اترتا۔ انسان کی محبت میں انسان اترتا ہے۔ انسان کی شکل میں انسان ہی کے اندر کی بات اترے گی۔ محبّت محبوب کی شکل میں۔ تو اگر محبوب بن کے کوئی ذات صاحبِ مزار اتری ہے آپ کے ہاں۔ کشاں کشاں آپ کو لے چلی ہے پتہ نہیں آپ کہاں جا رہے ہیں ؎

منم محوِ خیالِ اُو نمی دانم کجا رفتم

تو پھر پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ میں کہاں جارہا ہوں۔ تو پھر تو جانے والے کو مبارک ہو' لے جانے والے کو مبارک ہو اور جس نے بھیجا ہے اس کو بھی مبارک ہو۔ پھر تو فیض مل گیا اب اس کا مظہر بنتا ہے اس نے خود ہی اب کسی کو آپ کہتے ہو کہ داتا صاحبؒ کو چھوڑو آؤ آپ کو میں پیر مکیؒ لے چلوں' کہا نہیں کہ مجھے تو داتا صاحبؒ ہی جانا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس کو اس طرف کون سی قوت لے جارہی ہے۔ ذاتی تعلّق یا کچھ اور۔ دریا کے اندر سے کون سی مچھلی کو کنارے نے بلایا اللہ ہی بہتر جانے' کون سے انسان پر کون سی آسانی ہو گئی' یہ اللہ بہتر جانے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ کسی انسان کے پاس سے اگر کوئی انسان خاموشی سے گزرا اور اس کی دنیا ہی بدل گیا' پتہ نہیں کون تھا۔ صرف نگاہ ملا کے علم دے گیا' یا چھین کے لے گیا' یہ سب اس کے کمال ہیں۔ یہی ایک چیز بچا رہی ہے ہمیں اس کا امکان کم ہے۔ لیکن شاید

کہیں اس دروازے سے کوئی آواز نکلے اس لئے کہ ہمارے اپنے اعمال تو عبرت کے علاوہ اور کچھ نہیں دے رہے ہیں۔ ہمیں تو ایسا ایک اچھا حوالہ مل جائے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ جو لوگ پڑھتے ہیں نیاز' اب حالانکہ بے نیاز کی کیا نیاز ہوتی ہے لیکن خیر وہیں پر اگر لوگ اکٹھے ہوں تو آپ دیکھیں کہ سروس بہتر ہوگی' ساتھ میں لوگ وضو کریں گے۔ نماز بھی پڑھیں گے ایک عمل مشترک و پاکیزہ ہو جائے گا۔ تو اچھے حوالے اچھے نتائج پیدا کرتے ہیں اور شکر ہے کہ آج بھی کر رہے ہیں اور شاید یہی ہمارے بچاؤ کے راستے ہیں کہ ابھی ہم ان حوالوں میں گستاخ نہیں ہوئے۔ اب جیسے یہ محرم ہے تو یہ بھی خدا کا شکر ہے کہ اس کے حوالے ہمارے پاس موجود ہیں تو ان حوالوں سے ہمیں توقع ہے فیض کی بلکہ میں تو کہوں گا کہ .... ہے فیض کی۔

○
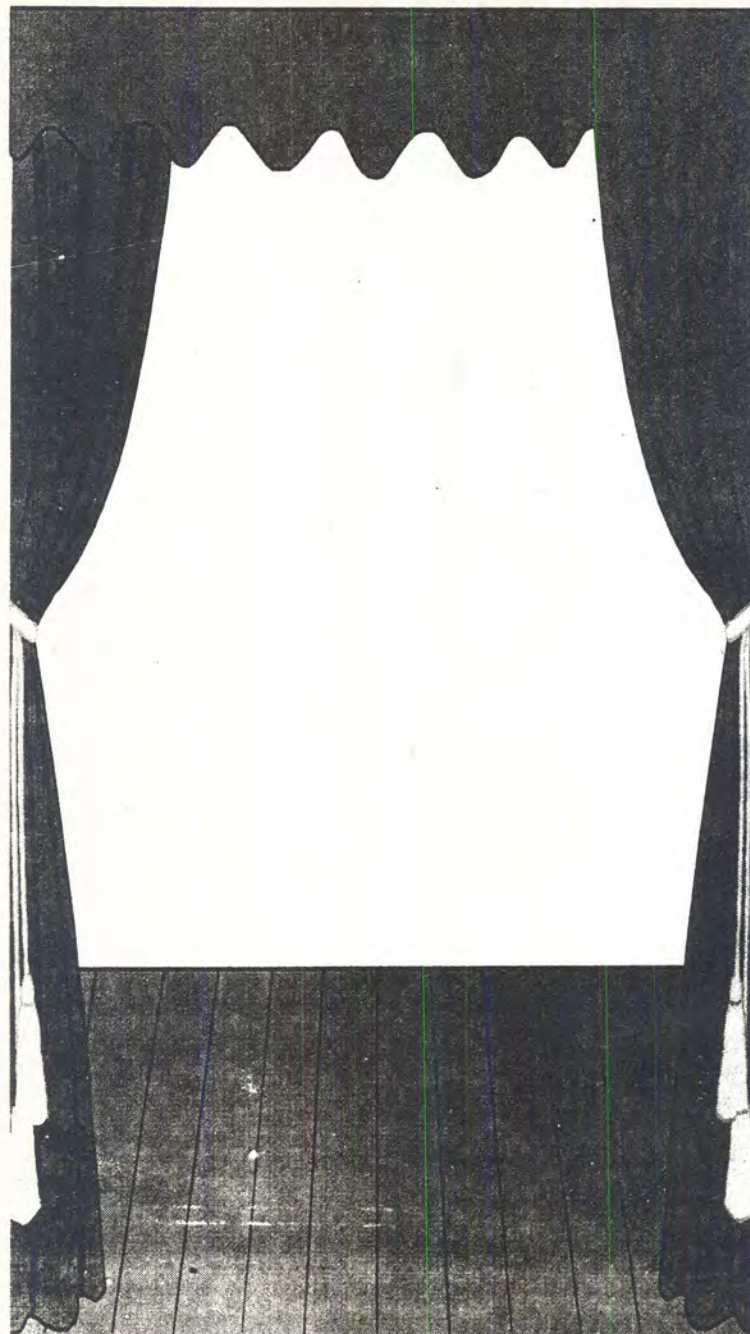
ریڈیو پاکستان لاہور کے ادبی جریدہ ''منشورہ''میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا جس کا موضوع تھا ''اردو ادب میں تصوّف کا مقام اور روایت''۔ پروگرام کی کمپیئرنگ معروف دانشور جناب اشفاق احمد صاحب نے کی۔ اردو ادبؔ کی فارسی اور عربی روایت کے تناظر میں ذوالفقار تابش صاحب نے بڑی سیر حاصل گفتگو کی۔ جنابِ واصف علی واصفؒ صاحب نے اس مکالمہ کے موضوع پر اپنے مخصوص اسلوب سے اپنے خیالات اِس طرح پیش کیئے کہ سننے والوں پر نئے علم کی روشنی کا دروازہ کھلتا گیا۔ اس مکالمہ کی روداد پڑھنے سے اس موضوع کی جہتیں پڑھنے والوں پر وا ہوتی جائیں گی۔

اردو ادب میں تصوّف کا مقام اور روایت

اشفاق احمد صاحب:

اس وقت نہایت ہی غیر روایتی انداز میں ہم جس موضوع پر سوچنے اور بحث کرنے کے لئے جمع ہیں اس کا عنوان ہے "اردو ادب میں تصوّف کا مقام اور روایت"۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کی ساری روایت اور بنیاد کسی نہ کسی طرح تصوّف پر قائم ہے۔ یہاں پر ذوالفقار تابش صاحب اور جناب واصف علی واصف صاحب موجود ہیں۔ ہمارے سامنے سوچ کی بہت سی لمبی، پرپیچ گلیاں ہیں اور بہت سے راستے ہیں۔ کوشش یہ کریں گے کہ اس موضوع کو ہم اس مختصر وقت میں سمیٹ کر کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔

واصف صاحب! میرا یہ خیال ہے کہ مشرق کی ساری زبانوں کی طرح یا مشرق کے سارے فلسفوں کی طرح یا مشرق کی سوچ کے مطابق، اردو زبان بھی تصوّف کا انگ اور رنگ لے کر آگے بڑھی ہے، بلکہ میں اگر یہاں تک کہہ دوں کہ تو آپ یقیناً اس بات کی تائید کریں گے کہ اردو زبان جب پیدا ہوئی تو ایک تصوّف والے کی وجہ سے پیدا ہوئی اور ایک تصوّف والے نے ہی اسے ایجاد کیا، پھر اس شخصیّت کے رچاؤ اور خیال

نے اسے آگے بڑھایا یعنی حضرت امیر خسروؒ۔ انہوں نے اردو زبان کو ایک صورت عطا کی۔ وہ جب اس زبان میں بات کرتے ہیں تو چاہے وہ ان کا دو سخنہ ہو' ان کی فارسی یا ہندی انگ کی غزل ہو' تو ان کے اندر معانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ حضرت امیر خسروؒ کے بعد اردو شاعری اور پھر جدید اردو نثر نے جب ایک باقاعدہ صورت اختیار کی تو اس میں بھی تصوّف کا وہ زور شامل تھا جس کے کس بل یا کندھوں پر یہ زبان آگے بڑھتی چلی گئی اور آج بھی یہ زبان جہاں تک پہنچی ہے اس کے پیچھے جو Dynamic Force یا متحرّک قوت موجود ہے وہ تصوّف ہی کی ہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

آپ نے بالکل صحیح وضاحت کردی ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے اس زبان کو جو وسعت عطا کی' اس وسعت کے پیچھے اس کو جو طاقت Generate کرنے والی ہے' اس زبان کو تقویّت دینے والی ہے' وہ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی ہے۔ تو لازمی بات یہ تھی کہ حضرت امیر خسروؒ کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا راضی کرنا مقصود تھا اور ان کو جو فیض ملا تھا اس کا انہوں نے اسی زبان میں اظہار کرنا تھا۔ اس لئے اس زبان میں تصوّف کا آنا اور تصوّف کے اثر کا آنا یا اس کے رچاؤ کا آنا لازمی تھا۔ اور پھر یہ اس کا نتیجہ نکلا کہ حضرت امیر خسروؒ نے اس زبان میں اپنے خیال کا جتنا بھی اظہار کیا وہ سارا خیال تصوّف کا ہی ہے حتیٰ کہ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ ۔

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؒ
محمدؐ شمعِ محفل بود، شب جائے کہ من بودم

تو یہ سب تصوّف کا اظہار ہے۔ اس کے بعد پھر آگے کا سفر ہے۔ میرے خیال میں اردو زبان کو تقویت دینے والے جتنے بھی بزرگ، ادیب آئے وہ سارے کے سارے کسی روحانی نظام سے وابستہ تھے یعنی وہ یا تو نقشبندی تھے، یا قادری تھے یا پھر چشتی، یا اسی طرح کسی اور سلسلے سے منسلک تھے۔ ایک بات یہ قابل غور ہے کہ جہاں رائٹر کا، ادیب کا یا شاعر کا ذاتی عقیدہ تصوّف کے مطابق نہیں تھا مگر سامعین کا تصوّف پر اتنا گہرا یقین تھا کہ اس ادیب یا شاعر کو وہ نظریہ دینا پڑا۔ تو سامعین کا قوی ہونا اس شاعر یا ادیب کے خیال کو بدل گیا۔ جس طرح آج کل ہمارے ہاں کئی ترقی پسند لوگ ایسے ہیں جو نعت میں بڑا کمال دکھا رہے ہیں اگرچہ وہ نعت کو خود تسلیم نہیں کرتے۔ تو یہ ہمارے دور کا فیض ہے۔ تو ہر دور اپنا ایک فیض رکھتا ہے۔ اس پچھلے دور میں ادب کے علاوہ جو سماج تھا اس میں تصوّف رائج تھا۔ لہٰذا تصوّف کا اظہار ادب میں ہونا لازمی تھا اور وہ بڑی فراوانی سے ہوا۔

اشفاق احمد صاحب:

لیکن اس کا تعلّق تو تصوّف کے مختلف طبقۂ ہائے فکر کے ساتھ ہے لیکن اس سے ماوراء بھی مثالیں ہیں۔ مثلاً" میں اور میرے ہم عصر لکھنے والے دوست جو ہیں وہ سوچی سمجھی سکیم کے تحت تصوّف یا صوفی اِزم کو نہیں آنے دیتے لیکن وہ در آتا ہے یعنی بعض اوقات ہماری کوشش کے

باوجود وہ ہماری تحریروں میں آجاتا ہے۔ تو یہ ایک تو اس علاقے کا' اس منطقے کا یا اس جگہ کا فیض ہے۔ سارے مشرق کے علاقے میں تصوّف کا رنگ ادب میں نمایاں ہے اور اس میں کتنی ہی سیکولر سوچ کیوں نہ آجائے مگر اس کے پیچھے یہ ایک بہت بڑی قوّت ہے جو ہر وقت سرگرمِ عمل رہتی ہے۔ میں ذوالفقار تابش سے پوچھوں گا کہ اس بارے میں ان کا کیا خیال ہے...؟

ذوالفقار تابش صاحب:

میں آپ دونوں حضرات سے متّفق ہوں لیکن میں بات کو ذرا ایک اور انداز میں دیکھنے کی کوشش کررہا ہوں کہ جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ خطہ ایک روحانی درجہ اور روحانی Attitude رکھتا ہے لیکن جب مسلمان یہاں آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ فارسی کا کئی سو سال تک جو چلن رہا وہ بھی تصوّف سے Charge تھا کیونکہ ہمارے ہاں جو فارسی شاعری عجم سے آئی یا ہمارے ہاں لکھی گئی اس میں بھی تصوف کا Element یا عنصر شامل تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ایک رویہ دریافت کیا کہ جس میں تصوّف ہماری زندگی اور ہمارے خمیر میں شامل ہوگیا اور صوفی نہ ہونے کے باوجود ہمارے رویے متصوّفانہ تھے۔ لوگوں کے میل جول' نشست و برخاست' گفتگو' چلن اور زندگی میں ایک دوسرے سے نسبت صوفیانہ ہوتی تھی۔ یہ کیفیّت اس وقت تک قائم رہی جب تک یہاں انگریز کا راج نہیں آیا تھا۔ اس میں عقیدے کی بھی پابندی نہیں تھی۔ مثلاً" ہم سب غالب کے بارے میں جانتے ہیں کہ ان

کا تصوّف کے کسی مدرسۂ فکر سے باقاعدہ تعلّق نہیں تھا مگر ان کی شاعری میں جا بجا تصوّف کے مضامین ہیں۔ اسی طرح میر تقی میؔر کوئی Paractising یعنی عملی صوفی تو نہیں تھے مگر ان کی شاعری کا رویہ' فلسفہ اور زندگی کا چلن خالصتاً" صوفیانہ ہے بلکہ وہ تصوّف کے ایسے ایسے نکتے بیان کرجاتے ہیں جو اس سے پہلے بہت کم صوفیاء نے دوسروں کو بتائے ہیں۔ آتش کے مضامین بھی صوفیانہ ہیں۔ تو یہ صوفیانہ رویہ جو تھا اس کا اثر پوری شاعری بلکہ پورے فنون لطیفہ پر ہوا اور نثر پر بھی۔ مثلاً" یہ جو کتاب ہے "آرائشِ محفل"' نثر کی اس کتاب کو جب میں نے پڑھا تو مجھے یوں لگا کہ یہ تو زندگی کا ایک بہت بڑا استعارہ ہے اور اس کے ہیرو کا جو Attitude ہے وہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ہمارے مشرق کا رویہ ہے اور ہمارے پورے مشرق کا رویہ وہی ہے جسے ہم صوفیانہ کہتے ہیں اور اس کے لئے عملی صوفی بھی ضروری نہیں ہے۔

اشفاق احمد صاحب:

یہ تو آپ نے نثر کی ایک کتاب کا ذکر کیا ہے لیکن فورٹ ولیم کالج کی جتنی بھی دوسری کتابیں ہیں اور کہانیاں ہیں ان میں تصوّف کو بڑا دخل ہے۔ میں واصف صاحب سے گزارش کروں گا کہ اس موضوع پر مزید روشنی ڈالیں....!

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

میرا خیال ہے کہ اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ شعر کس وقت' تصوّف میں داخل ہوتا ہے یا تصوّف کس وقت شعر میں داخل ہوتا ہے۔

اس سے بات اور واضح ہوجائے گی۔ اس میں غور کریں گے تو بات زیادہ واضح ہوجائے گی۔ شعر کے اندر جو حسن ہے' جمال ہے' یا ذوقِ جمال ہے' وہ شاعر کی اپنی ذاتی اور داخلی حسّیات ہیں۔ وہ جس وقت بھی اس کو آفاقیت کا لہجہ عطا کرے گا تو اسے تصوّف میں داخل ہونا پڑے گا۔ تو تصوّف کا مطلب یہ ہوا کہ جمال کا جو پہلو ذاتی حسیات سے آفاقیت کی طرف سفر کررہا ہے وہ تصوّف ہے۔ اس لئے وہ شعر جو بہت اچھا شعر ہے وہ تصوّف کے قریب ہوگا اور وہ شاعر جو بہت اچھا شاعر ہے وہ عالمگیر ہوگا اور آفاقیت رکھتا ہوگا۔ تو ایسا شاعر تصوّف کے قریب ہوگا۔ وحدتِ کائنات اور وحدتِ جمالِ کائنات جو ہے وہ شاعر کو عالمگیر بناتی ہے اور یہی شاعری اس شاعر کو تصوّف سے آشنا کرتی ہے۔ جو شعر جتنا بلند ہوگا اس میں اتنا ہی تصوّف ہوگا۔ مثلاً" غالب کہتا ہے کہ ۔

سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

تو جہاں تجسّس ہے' جہاں رموز ہیں' جہاں کائنات کی آگہی ہے' جہاں جمالِ کائنات کا تصوّر ہے' جہاں انسان کے مقام کو پہچاننا ہے' جہاں ذات کو پہچاننا ہے' جہاں زندگی اور موت کو پہچاننا ہے تو وہاں پر تصوّف ہے ۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل شور اسی سر پہ ہے پھر نوحہ گری کا

تو یہ سارے کا سارا واقعہ تصوّف سے ہے۔ مثلاً" تحیّر ہے' تعلّق ہے اور جتنے بھی بلند واقعات ہیں وہ شعر میں آئیں گے۔ تو تصوّف کا مطلب یہ

ہے کہ اس کائنات کو As it is پہچاننا اور اس سے لطف اندوز ہونا۔ تو تصوّف یہ ہے کہ اشیاء اور اسماء کے ذریعے خالقِ کائنات کو دریافت کرنا۔ تو یہ تصوّف ہے۔ جتنے بھی شعراء اور ادیب آئے' ادب والا جو چیز تخلیق کرتا ہے اگر تخلیق اس پر وارد ہونا شروع ہوجائے تو وہاں تصوّف شروع ہوجاتا ہے۔ گویا کہ تصوّف اور تخلیق دونوں نزل من غفور الرحیم یعنی "اللہ کی طرف سے نازل ہوتے ہیں"۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

اب یہ پورا تصوّف ہے۔ تو گویا کہ فانی کا باقی کے ساتھ بے ساختہ تعلق جو ہے یہ تصوّف ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ اگر آپ کے سامنے تاج محل ہے تو یہ تاج محل شعر بھی ہے یعنی ایک غزل کا شعر ہے اور تاج محل تصوّف بھی ہے بلکہ "نورٌ علی نور" ہے۔ جب ہم Conerete سے یعنی مجرّد سے Abstract یعنی غیر مجرّد کا سفر شروع کرتے ہیں تو وہاں سے تصوّف میں داخل ہوجاتے ہیں۔ تو تصوّف تو ہر حال میں شعر میں رہے گا۔ لہٰذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری میں آج تک کے شعراء تک اور جتنا بھی ادبی سفر ہوا' اس سفر کے اندر حسن اور استقامت عطا کرنے والے وہی لوگ ہیں جو تصوّف والے لوگ ہیں۔

اشفاق احمد صاحب:

آج کل بہت ساری شاعری ایسی بھی ملے گی جو زمینی حالات یا Mundane سے بندھی ہوئی ہے مثلاً" کرایہ' خرچ' مہنگائی' تنہائی وغیرہ۔ یہ ذاتی حسّیات اڑان لے کر ارفع اور اعلیٰ کی طرف نہیں جاتیں۔

اس سلسلے میں واصف صاحب سے درخواست ہے کہ وضاحت فرمائیں۔

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

مستند نقادوں کے مطابق شعر کے متعلّق یہ کہا گیا ہے کہ اس میں تقاضہ نہ ہو اور گلہ نہ ہو بلکہ حسن ہو اور حسن کی Appreciation ہو۔ تو جہاں ہم تقاضہ کررہے ہیں اور گلہ کررہے ہیں تو یہ تو کسی ضرورت کے اشعار ہیں اور ضرورت کے واقعات ہیں۔ ان کا آپ الگ جائزہ لیں کہ کیوں ایسا کہا جارہا ہے۔ مثلاً" ؎

شعر کہنے کو بھی روٹی کی ضرورت ہے

ایسے اشعار کو آپ الگ سے دیکھیں۔ تو روٹی کا ذکر، پیسے کا ذکر اور تنخواہ کا وقت پر نہ ملنا جو ہے یہ By definition شاعری نہیں ہے۔ تو شعر کے لئے ایک الگ کیفیت ہے، اس لئے شعر دلفریب ہونا چاہئے اور دلگداز ہونا چاہئے۔

اشفاق احمد صاحب:

اس عہد میں ہماری پرانی بندھی ٹکی روایت سے گریز بھی ہوا ہے اس لئے یہ عہد بہت بیچارہ ہے کہ جذبات سے گریز ہوا۔ واصف صاحب بتائیں گے کہ اس کی کیا وجہ ہے... ؟

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مراکز خاموش ہوگئے جہاں تصوّف کے آستانے ہوا کرتے تھے، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند

اس لئے وہاں خاموشی ہوگئی اور یہاں شاعر کے اندر نغمگی کمزور ہوگئی۔ جب نغمگی کمزور ہوجائے تو پھر ایسے اشعار اور ایسے واقعات پیدا ہوجائیں گے جن کے بارے میں آپ بتا رہے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کا بھی قصور کوئی نہیں ہے۔ تو اگر شعر کی بجائے نثر ہی شعر ہوجائے تو آپ اسے اس دور کی ضرورت ہی سمجھیں۔

اشفاق احمد صاحب:

واصف صاحب کی بات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ سمجھتے ہیں بلکہ ان کا پورا یقین ہے کہ ہمارے یہاں کا شاعر یا نثر نگار صرف اپنے لئے یا اپنے ذوق تخلیق کے لئے ہی نہیں لکھتا بلکہ اس کا ماحول اس سے غیر مرئی انداز میں ایسا کرنے کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

بلکہ آنے والے زمانے بھی اس سے یہ تقاضا کرتے ہیں۔ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا ماحول یا اس کا زمانہ اس پر اثر کرتے ہیں یا Cosmopolition ہوجانا کافی نہیں بلکہ شاعر یا تخلیق کار جو ہے وہ آنے والے زمانے کے لئے بھی ایک ضرورت ہے کیونکہ اس نے آنے والے زمانے کو کتاب دے کے جانی ہے اور ان لوگوں نے اس کتاب سے علم حاصل کرنا ہے۔ اس لیئے آنے والے زمانے کی بھی یہ ضرورت ہے اور گزرے ہوئے زمانے میں اس نے جو محنت کی ہے وہ بھی کہیں ضائع نہ ہوجائے۔ ان کو بھی دعا لینے کا حق ہے۔ اس لئے جو تخلیق کار ہے اس کو دونوں چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ مثلاً" اس سے پہلے کسی مکان کو بنانے

میں کتنی محنت ہوئی اور پھر آنے والے زمانوں میں کن انسانوں نے اس مکان میں رہنا ہے تاکہ اس مکان میں اسی قسم کا وارنش' پینٹ کیا جائے اور اس طرح کا حسن پیدا کیا جائے۔

اشفاق احمد صاحب:

تابش صاحب! آپ کیا کہنا چاہیں گے.... ؟

ذوالفقار تابش صاحب:

ہم اپنے یہاں ایک خاص وقت دیکھتے ہیں جس میں شعر و ادب فارسی زبان میں ہوتا تھا اور پھر اس کے بعد اردو کا زمانہ آتا ہے۔ انگریزی حکومت کے قیام تک ہماری زندگیوں میں ایک رویہ تھا جس میں تصوف کو ماننے اور نہ ماننے بلاامتیاز اپنی زندگی کا چلن صوفیانہ رکھتا تھا کیونکہ وہ اکثریتی معاشرے کا حصّہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہمارے ہاں اب جو شاعری ہے' نثری شاعری' ادبی شاعری اور غزل کی شاعری میں اس زمانے سے کچھ مختلف بات نظر آتی ہے اور وہ زیادہ مادہ پرست' زیادہ Down to the earth اور زیادہ مسائل سے بھرپور ہے۔ تو اس سے صوفیانہ طرز عمل کا کوئی پہلو نہیں نکلتا' داغ تک تو صوفیانہ رویہ قائم ہے۔ مثلاً" ۔

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

عام نظر سے یہ چھوٹے درجے کی شاعری محسوس ہوسکتی ہے لیکن اس عاشقانہ بات کو In depth دیکھا جائے تو یہ تصوّف کا بہت بڑا مضمون

ہے۔ لیکن جب حالؔی اور آزادؔ سے ہم نکلتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہ وقت ہے جب انگریزی شاعری کے زیر اثر شعر کہنے کی ایک روایت کی طرح ڈال دی جاتی ہے اور پھر ہم انگریزی شاعری پڑھتے ہیں' انگریزی ادب پڑھتے ہیں' دوسرے ملکوں کا لٹریچر پڑھتے ہیں' اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس سے متاثر ہونے کے بعد اس طرح کی' اس ہیئت کی اور اس طرز کی چیزیں لکھنا شروع کردیتے ہیں۔ تو پھر ہمارا ماحول بدلتا ہے' ہمارا استعارہ بدلتا ہے' ہمارے، حقائق بدلتے ہیں' چیزوں کو دیکھنے کی ہمارے Approach بدل جاتی ہے' زاویہ نگاہ بدل جاتے ہیں ---- پھر ہم کہتے ہیں کہ جیسے وہاں کے ملک کا Angry young man یعنی "ناراض نوجوان" شاعری کررہا ہے' اگرچہ وہ پرابلم ہمارے ملک میں نہیں ہے لیکن لوگوں میں ایک امتیازی حیثیّت حاصل کرنے کے لیئے میرے لئے ضروری ہے کہ میں بھی اس طرح کی شاعری کروں۔ مثلاً" وجودیّت کا مسئلہ ہمارے ملک میں اب بھی نہیں ہے مگر ان کے تتبع میں یہاں افسانے لکھے گئے' ڈرامے لکھے گئے اور ابسٹرکٹ شاعری لکھی گئی۔ نثری شاعری کے بارے میں' میں یہ کہوں گا کہ ابھی تو آزاد نظم بھی ہمارے قاری کے حلق سے نہیں اتری اور آپ اسے نثری شاعری سے دوچار کررہے ہیں۔ تو ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ بدلتے ہوئے زمانے سے کس طرح ہمارے ادب پر اثر پڑتا گیا ہے۔

اشفاق احمد صاحب:

انگریز کے آجانے کے بعد بھی ہماری شاعری کی شکل و صورت'

مزاج اور اس کی روح وہی رہی جو کہ اس سے پہلے ہماری فارسی شاعری کی شکل تھی۔ انگریز ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری روح اور ادب میں تصوّف کی روح اسی طرح کارفرما رہی جیسے پرانے زمانے میں تھی مثلاً" حالی اور آزاد کے زمانے میں انگریز بھرپور طریقے سے اقتدار میں تھے۔ یہ اس کے بعد کی بات ہے اور اس میں انگریزوں کا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا اتنا قصور نہیں ہے جتنا ہمارے مطالعے کا ہے۔ اور اس میں تین چار ایسے آدمی ہیں جنھوں نے ساری دنیا پر اپنا اثر پھینکا ہے اور انہوں نے ساری دنیا کو خدا سے' تصوّف سے' انسانی محبت سے' انسانی رشتوں سے' حسّیات سے' جذبات سے' احساسات سے اور اِدراک سے توڑا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن میں ایک ڈارون ہے جس نے کہا کہ بندر ہمارا بڑا ہے۔ اس کے بعد سگمنڈ فرائڈ آتا ہے۔ پھر کارل مارکس آتا ہے' اس نے بظاہر لوگوں سے محبت کا درس دیا لیکن اس کے نتیجے میں لوگ ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکے۔ ان تینوں نے اور دوسری فکر کے کچھ فلسفیوں نے اس تصور کو آگے بڑھایا ہے۔ اس سے لطیف احساسات اور حسّیات کی کمی ہوتی گئی اور سوچ کے سخت اور Crude پہلو آتے گئے۔ انہوں نے ہماری شاعری اور ہمارے ادب پر بھی اثر کرنا شروع کردیا۔ ایک عام آدمی یہ کہتا ہے کہ جوبات مجھے نظر نہیں آتی وہ غلط ہے اور خوردبین میں دیکھنے والا جراثیم دیکھتا ہے اور ماورائے خوردبین کو غلط سمجھتا ہے۔ پھر اس کے بعد الیکٹرانک خوردبین آگئی تو اس میں دیکھنے والے نے کہا کہ اس میں جو نظر آتا ہے وہ صحیح ہے اور باقی سب غلط ہے۔ اس طرح سوچ تنگ ہوتی چلی گئی اور اس کا اثر ہمارے ادب پر

بھی بڑی شدت سے ہوا کیونکہ ہم نے اپنی سوچ کے سارے سوتے اس طرف کو کھول دیئے۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کے لئے ایک بڑی مشکل سامنے آگئی کہ وہ بظاہر عوام سے محبت کرتے تھے اور ان کی تکلیف کو اجاگر کرنے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن وہ بانوے بلکہ اٹھانوے فی صد لوگوں سے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ تو یہ عجیب Paradox پیدا ہوگیا اور یہ ہمارے ادب میں بھی اثر انداز ہوا۔ تو جنابِ واصف صاحب! اس سب کے باوجود وہ لوگ جو ہمارے دور دراز علاقوں میں اپنی اردو شاعری میں مخمس، مسدّس اور مثنوی لکھتے رہے ان لوگوں کی وہ شاعری، نثر یا قصص لوگوں تک پہنچتے رہے اور لوگوں تک ان کی دھرتی سے جڑا ادب پہنچتا رہا۔ اس میں گراف اور مقدار اوپر نیچے ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ یہ دیکھیں کہ ن۔م راشد کی شاعری چاہے جتنی جدید ہو مگر اس میں کوزہ اور کوزہ گری کا ذکر ضرور آئے گا۔ تو ایسی صورت میں وہ بات لوٹ کر تصوّف کی طرف آئے گی اور تصوّف کی پھوار میں چلی جائے گی۔ اس اعتبار سے تصوّف کی روایت بدستور قائم ہے۔

واصف صاحب سے میں یہ کہوں گا کہ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ آئندہ کے بارے میں بھی سوچیں کہ مستقبل قریب میں یہ صورتحال جو ہے یعنی جو سطحی قسم کا تخلیقی عمل ہورہا ہے، یہ تصوّف کے ساتھ یا لوگوں کی سوچ کے ساتھ یا لوگوں کے روحانی تقاضوں کے ساتھ کس حد تک ہم آہنگ رہے گا ----- کیا یہ علیحدہ ہوجائے گا یا بدستور قائم رہے گا ----- آپ اس بارے میں کچھ فرمائیں۔

جنابِ واصف علی واصف صاحب:

اس بات کا ان لوگوں سے وابستہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں کی ضرورت کے لئے اللہ تعالیٰ نئے تخلیق کار پیدا کردے گا اور پھر روحانیت میں یا تصوّف میں ایک نیا مقام پیدا ہوجائے گا۔ تو جس وقت لوگوں کی جیسی ضرورت ہوتی ہے تو ادب میں اسی قسم کے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ادب جو ہے یہ Spontaneous ہے اور اس نے کسی پروگرام کے تحت تخلیق نہیں ہونا بلکہ اس نے خود بخود ہی پیدا ہوجانا ہے، جس طرح کہ کسی موسم میں کوئی پودا خود بخود پیدا ہوجاتا ہے، خود بخود بارش ہوجاتی ہے، اسی طرح اس طرح کا ادب بھی خود بخود پیدا ہوجاتا ہے۔ تو اس ملک کی ضرورت اور ان لوگوں کی ضرورت کے مطابق اس طرح کا ادب پیدا ہوتا ہی رہے گا جس طرح کہ یہ تصوّف جاری رہے گا، اسی طرح یہ ادب چلتا ہی رہے گا۔ تو ادب میں تصوّف کا عمل دخل ضرور ہی رہے گا۔

اشفاق احمد صاحب:

آخر میں کیا خوش آئند بات ہوئی ہے کہ ہمارے سامنے جو مستقبل آرہا ہے اس میں یہ ادب چلتا ہی رہے گا اس میں یہاں کی خُو اور بُو، اس علاقے کے تقاضے اور آرزوئیں اپنے طور پر بھی جاری و ساری رہیں گی۔ اس کے ساتھ ہی محفل کا اختتام ہوتا ہے۔ شکریہ!

(بشکریہ ریڈیو پاکستان ۔ لاہور)

ترتیب: ڈاکٹر مخدوم محمد حسین